مئی ۱۹۶

لائبریری
قرآن اکیڈمی کراچی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعتِ خصوصی مشتمل بر

"پاکستانی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دور

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ۱۹۶۹ء کے سیاسی تجزیے

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی

امتحانات سے فارغ طلبہ کے لئے

دینی معلوماتی تربیتی کورس

18 مئی تا 27/ جون 1996ء (6 ہفتے)

قرآن کالج لاہور

میں منعقد ہوگی (ان شاء اللہ)' جس میں مندرجہ ذیل مضامین کی تدریس ہوگی :

1 ۔ نماز و قراءت قرآن کی تصحیح
2 ۔ مطالعہ دینی لٹریچر
3 ۔ قرآن حکیم کے منتخب اسباق
4 ۔ عربی گرامر (ابتدائی)
5 ۔ انگریزی گرامر
6 ۔ انگریزی و اردو خوشخطی
7 ۔ ارکان اسلام اور ان سے متعلق تفصیلات

نوٹ

- اس کورس میں رجسٹریشن کی آخری تاریخ 16 مئی 1996ء ہے۔
- اوقات تعلیم صبح 8 بجے سے 12 بجے دوپہر ہوں گے۔
- کورس فیس مبلغ 250 روپے ہے' جس میں جملہ کتب کی قیمت شامل ہے۔
- ہاسٹل میں رہائش کی محدود گنجائش ہے۔
- ہاسٹل میں 6 ہفتے کے قیام و طعام کا خرچ 1000 روپے ہوگا۔
- مستحق طلباء کے لئے رعایت کی گنجائش ہے۔
- تدریس کا آغاز ان شاء اللہ 18 مئی سے ہو جائے گا۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج لاہور

191۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور۔ فون : 5833637

زیر اہتمام : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۵
شمارہ: ۵
ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ
مئی ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

زیر نظر شمارہ اپنے مندرجات کے اعتبار سے "میثاق" کی عام معمول کی اشاعتوں کے مقابلے میں بہت مختلف اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ یہ پورا شمارہ امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ان سیاسی تجزیوں پر مشتمل ہے جو جنوری ۱۹۶۹ء تا اکتوبر ۶۹ء ماہنامہ "میثاق" کے اداریوں کے طور پر شائع ہوئے۔

ایک دینی انقلابی تحریک کے داعی کا سیاسی امور کے بارے میں رائے زنی کرنا اگرچہ بظاہر کچھ عجیب اور کسی قدر ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے لیکن ہمیں قوی امید ہے کہ اس بارے میں امیر تنظیم کے نقطۂ نگاہ سے اکثر قارئین بخوبی آگاہ ہوں گے۔ اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں امیر تنظیم نے اس ضمن میں اپنا مستقل موقف نہایت وضاحت اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کے مقدمے میں امیر تنظیم نے اس صراحت کے بعد کہ "میرے بارے میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے اور خود میں نے بھی اس کا بارہا اظہار کیا ہے کہ میں معروف معنی اور مروجہ مفہوم کے اعتبار سے ہرگز ایک سیاسی آدمی نہیں ہوں" اپنی تحریر و تقریر میں ملکی حالات پر گفتگو اور سیاسی امور پر رائے زنی کا سبب بایں الفاظ بیان فرمایا:

> "....اس کا اصل سبب یہ ہے کہ "سیاست" اگرچہ فی الاصل ایک نہایت وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے لیکن پوری دنیا میں بالعموم اور ہمارے یہاں بالخصوص اس کا ایک ہی محدود مفہوم رائج ہے۔ یعنی انتخابات میں حصہ لے کر حکومت کے حصول یا اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ پوری دنیا میں یہ امر مسلّم ہے کہ صحافت سیاست کا اہم ترین شعبہ ہے' اس لئے کہ یہ رائے عامہ کو ایک خاص رخ پر ہموار کرتی ہے جس کا براہ راست اثر انتخابات پر پڑتا ہے' تاہم مروجہ معنی میں صحافیوں کو سیاسی آدمی کہیں بھی قرار نہیں دیا جاتا۔ اس اشکال کو اس طرح بآسانی حل کیا جا سکتا ہے کہ سیاست کو دو شعبوں میں منقسم سمجھا جائے۔ ایک نظری یا بالواسطہ سیاست اور دوسرے عملی یا براہ راست سیاست۔ ان میں

جہاں تک مؤخر الذکر یعنی عملی سیاست کا تعلق ہے اس نے عہدِ حاضر اور بالخصوص مغربی ممالک میں ایک پیشہ (Profession) کی حیثیت اختیار کر لی ہے لہٰذا یہ ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں ہے بلکہ صرف پیشہ ور سیاستدانوں کی جولانگاہ ہے' لیکن جہاں تک مقدم الذکر یعنی نظری سیاست کا تعلق ہے تو کم از کم نظری اعتبار سے یہ ہر باشعور انسان کے لئے لازمی ہے' اس لئے کہ ملک اور قوم کے معاملات پر غور و فکر اور ان کو درپیش مسائل کے لئے سوچ بچار اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے دامے' درمے' سخنے کوشش ہر باشعور شہری کا فرض عین ہے اور اس سے اغماض و اعراض یقیناً ملک اور قوم سے بد عہدی اور بے وفائی کے مترادف ہے...."

حقیقت یہ ہے کہ کسی انقلابی جماعت کے کارکنوں کے لئے جہاں دینی و اخلاقی تربیت کا اہتمام ضروری ہوتا ہے وہاں ان کی سیاسی تربیت یعنی ملکی سیاسی حالات کا واضح شعور' کارفرما سیاسی قوتوں کے پس منظر اور شجرۂ نسب کا صحیح صحیح ادراک بھی ایک ناگزیر ضرورت ہوتا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' کے زیر ادارت ماہنامہ "میثاق" کی اشاعت کا آغاز تو اگرچہ ۱۹۶۶ء میں ہو گیا تھا تاہم سیاسی تجزیوں پر مشتمل اداریوں کی اشاعت کا آغاز ۶۷ء سے ہوا۔ ان اداریوں میں امیر تنظیم نے تحریک پاکستان کے سیاسی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس بارے میں اپنا نقطۂ نظر بصراحت بیان کیا۔ پھر ۶۸ء میں بھی جب سابق صدر ایوب خان کا تخت حکومت ڈانواڈول تھا' ملک کی سیاسی صورتحال کے بارے میں متعدد اداریئے ماہنامہ میثاق کی زینت بنے۔ ۶۷ء اور ۶۸ء کے دوران شائع ہونے والے یہ سیاسی تجزیئے اب "اسلام اور پاکستان" نامی کتاب کی صورت میں دستیاب ہیں۔

پاکستانی سیاست کے نئے دور کا آغاز ۶۹ء میں ہوا۔ ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے کے بعد اب ایک طویل مدت بعد مختلف سیاسی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کو قسمت آزمانے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس دور میں بھی امیر تنظیم نے تسلسل کے ساتھ "میثاق" کے لئے سیاسی تجزیئے تحریر کئے اور میدان سیاست میں باہم نبرد آزما مختلف کرداروں کے پس منظر اور ملکی سیاست میں ان کے حقیقی کردار کو عمدگی سے واضح کیا۔ زیر نظر شمارے میں انہی

سیاسی تجزیوں کو ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔

ان ۲۷ برسوں کے دوران اگرچہ وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے' کمیونزم اور USSR کی موت کے بعد عالمی حالات میں بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے' پاکستان کی داخلی سیاست میں بھی بائیں بازو کے نمایاں سیاسی گروپ اب زیر زمین جا چکے ہیں' چنانچہ پیپلز پارٹی بھی اب اپنے سابقہ نظریات میں سے اکثر سے اس حد تک تائب ہو چکی ہے کہ اسے بائیں بازو کی سیاسی جماعت قرار دینا اب کسی طور مناسب معلوم نہیں ہوتا' تاہم ملکی سیاست کے میدان میں آج بھی بہت سے کردار وہی ہیں جو آج سے ستائیس اٹھائیس برس پہلے برسرعمل بلکہ برسرپیکار تھے۔ ان کرداروں کے پس منظر کو جاننے اور ملکی سیاست میں ان کے رول کو سمجھنے کے لئے زیر نظر شمارے میں شامل مضامین ایک کلید کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین ان مضامین کو دلچسپ اور مفید پائیں گے۔ OO

لَن یَنَالَ اللّٰہَ لُحُومُہَا وَلَا دِمَآؤُہَا وَلٰکِن یَنَالُہُ التَّقْوٰی مِنکُمْ
(الحج - آیت ۳۷)
اللہ تک تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا مگر تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔
قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ!
عیدالاضحیٰ کے مبارک موقع پر قربانی کے ساتھ
قربانی کی روح اور مقاصد کو سمجھنے کے لیے
امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف
عیدالاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی
کا مطالعہ ضرور کیجئے
• سفید کاغذ • رنگین سرورق • ۴۸ صفحات • قیمت صرف ۸ روپے
قریبی بکسٹال سے خریدیئے یا ہم سے منگوا لیجئے!
مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶-K ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!

پاکستانی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دَور

امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریکِ خلافت پاکستان

ڈاکٹر اِسرار احمد

کے سیاسی تجزیے

جو ۱۹۶۹ء کے دوران ماہنامہ "میثاق" کے ادارتی صفحات میں شائع ہوئے

ترتیب

باب اوّل: فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا زوال ۷
اور ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی کیریئر کا آغاز

باب دوم: جنرل محمد یحییٰ خاں کا مارشل لاء ۵۱

باب سوم: "میری تعمیر میں مضمر تھی کچھ صورت خرابی کی!" ۶۱

باب چہارم: "حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!" ۷۴

باب اوّل

فیلڈ مارشل محمّد ایّوب خاں کا زوال
اور ذوالفقار علی بھٹّو کے سیاسی کیریئر کا آغاز

(۱)

جنوری ۱۹۶۹ء

اب سے ڈھائی تین ماہ قبل پاکستان کی سیاسی فضا میں جو زبردست طوفانی ہلچل پیدا ہوئی تھی' اس کا زور تو اگرچہ اب کم ہو گیا ہے اور دوبارہ کچھ ویسی ہی سکون آمیز کیفیت سیاسی میدان پر طاری ہو گئی ہے جیسی کسی بڑے طوفانِ بادوباراں کے بعد فضا پر طاری ہوتی ہے {۱} تاہم اس طوفان نے سیاسی میدان کے بہت سے گوشوں کو نکھار دیا ہے اور بہت سے زیرِ سطح رجحانات کو سطح پر لا کر نمایاں کر دیا ہے------ "میثاق" اگرچہ ملکی سیاسیات سے بالعموم زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا' تاہم اس وقت جو صورت حال سامنے ہے اس سے بالکل صرفِ نظر بھی ممکن نہیں ------ بنابریں ہم بعض مسائل و معاملات کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

میدانِ سیاست کی اس حالیہ سرگرمی کی ابتدا کچھ تو واقعتاً طوفانی انداز کی تھی اور کچھ اس بنا پر بہت زیادہ طوفانی محسوس ہوئی کہ ایک عرصے سے ہمارے ملک میں سیاست کے میدان پر قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی---ورنہ ظاہر ہے کہ ہر آزاد ملک میں کچھ نہ کچھ سیاسی سرگرمی تو ہر وقت ہی جاری رہتی ہے' جو انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی کبھی کبھی طوفانی انداز اختیار کر لیتی ہے (جیسا کہ حال ہی میں فرانس میں ہوا تھا!) رہے درمیانی درجے کے ممالک تو ان میں تو اکثر و بیشتر سیاست چلتی ہی اس انداز پر ہے' مثلاً ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں سال بھر کے دوران شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اس کے کسی نہ کسی حصے میں بالکل اسی طرح کی صورت حال موجود نہ رہتی ہو

{۱} اگرچہ کچھ نہیں کہا جا سکتا' عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو!

جیسی ہمارے یہاں اس طوفان کے ابتدائی دنوں میں تھی---ہمارے یہاں چونکہ ایک طویل عرصے کے تعطل کے بعد سیاسی سرگرمی کا آغاز ہوا تھا لہٰذا کچھ تو یہ فی نفسہٖ تیز و تند (RASH) تھی اور کچھ انتظامیہ بھی اس کے لئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اس کی جانب سے صورت حال سے عہدہ برآ ہونے میں شدید غلطیاں ہوئیں۔ نتیجتاً آگ مزید بھڑکی اور کچھ ایسا سماں بندھا کہ ایک بار تو بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے صدر ایوب کی حکومت خاتمے پر ہے اور پاکستان فوری طور پر کسی نئی سیاسی و انتظامی صورت حال سے دوچار ہونے والا ہے---- لیکن رفتہ رفتہ صورت حال سنبھل گئی۔ چنانچہ ایک طرف کچھ تو ایجی ٹیشن کا زور مدھم پڑا اور کچھ حکام سنبھلے' اور دوسری طرف کچھ اپوزیشن کی اپنی صفوں کے بعض رخنے منظر عام پر آئے اور کچھ حکومت کی اعلیٰ ترین سطح کی جانب سے بھی سیاسی گفتگو پر آمادگی کا اظہار ہوا---- نتیجتاً حالات و واقعات نے کسی فوری اور ہنگامی معاملے کی بجائے مسلسل اور مستقل سیاسی سرگرمی کی صورت اختیار کر لی--------!!

ہمارے نزدیک سیاسی میدان کی یہ سرگرمی بجائے خود ملک و ملّت کے حق میں ایک فال نیک ہے۔ قبرستان کی سی خاموشی یا جیل کا سا "سب اچھا!" حکمرانوں کے نقطۂ نظر سے چاہے کتنا ہی خوش آئند ہو' کسی آزاد ملک اور زندہ قوم کے حق میں زہرِ ہلاہل سے کسی طرح کم نہیں۔

ہمارے نزدیک عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملکی و ملی مسائل سے بھرپور دلچسپی لیں اور اپنے بھلے اور برے کے بارے میں خود سوچیں۔ اپنے ملک کے انتظامی معاملات کا فیصلہ اور اپنی قومی پالیسیوں کے رخ کا تعین عوام کا حق ہی نہیں فرض ہے----اور خاص طور پر پاکستان ایسے زیر ترقی ملک میں تو اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ عوام انتظامیہ پر نہ صرف یہ کہ کڑی نظر رکھیں بلکہ اسے پوری طرح لگام دے کر رکھیں ورنہ سیاسیات کے اس مشہور و معروف اصول کے مطابق کہ "اختیار و اقتدار میں بے راہ روی کا رجحان فطری طور پر موجود ہوتا ہے اور اقتدارِ مطلق تو لازماً بے راہ ہو کر رہتا ہے!{۲}" ایک بے لگام اور بگٹٹ انتظامیہ کا بے راہ اور کج رو ہونا قطعی و یقینی ہے!!

"Authority tends to corrupt;and absolute authority corrupts alsolutely" {۲}

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دس سالوں میں ملکی سیاست کے بازار میں خاصی رونق رہی تھی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ "پارلیمانی سیاست" کی گہما گہمی اور حالات کی تبدیلی اور واقعات و حوادث کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا تھا ---- اگرچہ مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں کے فقدان کے باعث میدانِ سیاست کی یہ ساری گرما گرمی خیر کے بجائے شر پیدا کرتی چلی گئی' جس کا منطقی نتیجہ ۵۸ء کے فوجی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہم نے مئی ۶۷ء میں ان ہی صفحات میں ۵۸ء کے اس فوجی انقلاب کی نوعیت' اس کے اسباب و علل اور عواقب و نتائج کے بارے میں جو رائے پیش کی تھی وہ حسب ذیل ہے :

"میدانِ سیاست کے اس اختلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر رفتہ رفتہ سروسز کے جانب منتقل ہوتی چلی گئی -- تا آنکہ ۵۸ء میں صدر ایوب نے تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے کر فوجی حکومت قائم کر دی اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ایک طرف حکومت کا پورا نظم و نسق کلیتہً سروسز کے حوالے کر دیا اور دوسری طرف بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے سیاسی حقوق اور اختیارات کو تدریجاً عوام کے جانب منتقل کرنے کا وہی سلسلہ از سرِ نو شروع کیا جس پر تقریباً نصف صدی قبل غیر ملکی حکمران عمل پیرا ہوئے تھے --- گویا پاکستان کی عوامی سیاست ایک دم واپس نصف صدی قبل کے مقام پر پہنچ گئی! ملی اور قومی نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال یقیناً نہایت تشویش ناک اور پریشان کن ہے اور ہر مخلص اور محبِّ وطن پاکستانی کو لازماً اس پر سخت مضطرب اور غمگین ہونا چاہئے --- لیکن اس حقیقت کو ہر آن پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس کا اصل سبب قوم میں سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی اور ملی و قومی احساسات کا خوفناک حد تک فقدان ہے! کسی ایک یا چند افراد کے سر اس پوری صورت حال کی ذمہ داری تھوپ دینا یا سیاسی بے بصیرتی کا شاہکار ہے یا علمی خیانت کا!"

بہرحال مارشل لاء کے نافذ ہوتے ہی فطری طور پر ملکی سیاست کا بازار ایک دم بند ہو گیا اور تمام سیاسی حلقے موت و زیست کی کش مکش سے دوچار ہو گئے۔

مارشل لاء تو ہمارے ملک میں اگرچہ چند ہی سال جاری رہا اور چاہے کسی کو پاکستان کے موجودہ دستور سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ ۶۲ء سے ہمارے ملک میں ایک باقاعدہ دستوری حکومت قائم ہے -----

لیکن بالکل ایسے جیسے حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد بھی ایک عرصے تک جنوں اور شیطانوں پر ان کی ہیبت و وحشت کے اثرات قائم رہے تھے۔ ہمارے سیاسیئین کو بھی مارشل لاء کے صدمے سے ہوش میں آنے میں کافی وقت لگا ----- اور مارشل لاء کے خاتمے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ملکی سیاست کے میدان میں مکمل سرد بازاری کا سماں طاری رہا!

یہ واقعہ ہے کہ مارشل لاء کے صدمے سے سب سے پہلے ہوش میں آنے والی جماعت' جماعت اسلامی تھی' جو سیاسی جماعتوں پر سے پابندی اٹھ جانے کے فوراً بعد ایک منظم جماعت کی حیثیت سے برسرکار ہو گئی ----- اور یہ اس لئے ممکن ہو سکا کہ اس کے کارکنوں نے مارشل لاء کے دوران بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنی اجتماعیت کو برقرار رکھا تھا ---- دوسرے نمبر پر حرکت میں آنے والا گروپ نظامِ اسلام کا تھا ----- مسلم لیگ کے احیاء کی کوشش ہوئی تو وہ فوراً سرکاری اور مخالفِ سرکار دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ رہے پاکستان کے اکثر قدیم' خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان تو ان کی اکثریت صورت حال کو کچھ زیادہ امید افزا نہ پا کر بدستور گوشہ عافیت میں دبکی رہی۔

۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے موقع پر ۵۸ء کے بعد پہلی مرتبہ ملکی سیاست کے میدان میں کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔ اور محترمہ فاطمہ جناح کی ہمت و جرأت نے دیمک کی طرح مارشل لاء کے عصائے سلیمانی کو چٹ کر لیا۔ تب سیاسی سورماؤں کو ہوش آیا اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ لیکن اب وقت کم تھا اور صدر ایوب کی سیاسی حکمت عملی نے انتخابات کو ملتوی کرنے سے انکار کر کے "احزابِ" مخالف کے ہاتھوں سے موقع چھین لیا!

اس موقع پر مخالف احزاب نے "COP" کے نام سے جو متحدہ محاذ قائم کیا تھا اس کے پاس عوام کو اپیل کرنے کے لئے آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کے قیام کا بھاری بھرکم نعرہ تھا۔ لیکن تجزیئے سے جو بات سامنے آتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ صدارتی طرز حکومت کے بجائے پارلیمانی طرز کا احیاء مطلوب تھا اور بس۔ اس مطالبے اور اس کے لئے متحدہ محاذوں کے قیام کے بارے میں ہماری پختہ رائے وہی ہے جو ہم نے مئی ۶۷ء کے متذکرہ بالا تذکرہ و تبصرہ میں عرض کی تھی' یعنی یہ

کہ :

"ساتھ ہی یہ موٹی سی بات بھی ہر مخلص پاکستانی کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اس کا علاج نہ صدارتی اور پارلیمانی جمہوریت یا بلاواسطہ و بالواسطہ انتخابات کے مسئلوں پر وقتی ہنگامے اٹھانے سے ہو سکتا ہے نہ مینڈکوں کی پنسیری کی طرح کے بالکل انمل بے جوڑ متحدہ محاذوں کے قیام سے ------! اس صورت حال کی اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ بالکل فطری طریق پر عوام میں سے کوئی سیاسی جماعت ایسی اٹھے جو مسلسل محنت و مشقت اور پیہم جدوجہد کے ذریعے ایک طرف ان میں سیاسی شعور اور اپنے بھلے اور برے کی حقیقی پہچان پیدا کرے اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد میں ایسے قومی کارکنوں کو تربیت دے کر تیار کرے جو ہر طرح کے مفادات سے صرف نظر کر کے خالص اصولوں کے لئے کام کر سکیں اور اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور قوم کی بہتری اور بھلائی کے لئے انتھک محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کی صلاحیت رکھتے ہوں----!"

۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کے چار سالوں کے بعض حالات و واقعات کا تذکرہ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کے صحیح تجزیئے اور ان مختلف عوامل کے صحیح فہم کے لئے ناگزیر ہے جو اِس وقت ملک کی سیاسی فضا میں برسرِ کار ہیں :

۱۔ ۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے دوران جو زلزلہ سا صدر ایوب کے ایوانِ اقتدار میں محترمہ فاطمہ جناح کی شرکت کے باعث آ گیا تھا' اس سے خبردار ہو کر صدر ایوب نے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے اور اس غرض کے لئے اپنی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر از سرِ نو منظم کرنے کی جانب توجہ کی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے انہوں نے سر توڑ کوشش کی۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں جبکہ احزاب اختلاف ابھی کچھ تو اپنی انتخابی شکست کے زخم چاٹنے میں مصروف تھیں اور کچھ باہم دست و گریباں بھی ہو گئی تھیں' کنونشن لیگ کی تنظیمِ نو کا خاصہ چرچا ہوا اور کچھ عرصے تک تو یہ محسوس کیا گیا کہ شاید آئندہ اس ملک کی واحد سیاسی تنظیم سرکاری لیگ ہی ہو گی---- لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ نہ تو صدر ایوب عوام میں کوئی "جذبۂ تازہ" پیدا کر سکے اور نہ ہی مخلص اور محنتی کارکنوں کی کوئی ٹیم تیار کر سکے---- چنانچہ ادھر کچھ عرصے سے صدر ایوب کے قریبی حلقے کے لوگ بھی برملا اعتراف کر رہے ہیں اور غالباً حالیہ سیاسی ہنگاموں کے بعد تو صدر ایوب خود بھی

محسوس کرتے ہوں گے کہ وہ پاکستان مسلم لیگ کو ایک منظم اور فعال عوامی جماعت بنانے کی کوشش میں قطعاً ناکام ہو گئے ہیں اور اس کوشش میں جو وقت اور سرمایہ صرف ہوا وہ اکثر و بیشتر ضائع ہو گیا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں کسی عوامی جدوجہد کے دوران محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے ذریعے منظم و مستحکم ہوا کرتی ہیں اور مصائب و تکالیف کے الاؤ اور ابتلاؤں اور آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزر کر ہی ان کے کارکنوں کا مسِ خام کندن بنتا ہے' مسندِ اقتدار تک رسائی کے بعد سے تو فوری طور پر کسی سیاسی جماعت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ حکومت کے ایوانوں اور اقتدار کی مسندوں پر بیٹھ کر سیاسی جماعتوں کی تنظیم کی کوشش ویسا ہی احمقانہ خیال ہے جیسا یہ منصوبہ کہ پہلے سیدھے یا ٹیڑھے جس راستے سے بھی ممکن ہو اقتدار پر قبضہ جما لیا جائے اور پھر اس کے ذریعے ایک عوامی اسلامی انقلاب برپا کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ کنونشن لیگ سے منسلک لوگوں میں سے اکثر و بیشتر کی اصل نظر مفادات پر ہے اور ان ہی کی باہمی بندر بانٹ پاکستان مسلم لیگ کی اصل اجتماعی سرگرمی ہے' نہ اس کے پاس مخلص کارکن ہیں اور نہ ہی عوام کی پشت پناہی اسے حاصل ہے------ نتیجتاً صدر ایوب کی حکومت یا تو خود ان کی اپنی ذات کے بل پر قائم ہے' یا سروسز کے سہارے' اس کی کوئی حقیقی اور واقعی سیاسی اساس موجود نہیں ہے۔

۲ ۔ ۶۵ء کی پاک ہند جنگ بلاشبہ گزشتہ صدارتی انتخابات کے بعد کے دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ملک کے بقاو دفاع اور خاص طور پر اس کی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے ہی' ملک کی داخلی سیاست پر بھی اس کے بہت گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہمیں یہاں اس سترہ روزہ جنگ کے اسباب و علل سے تو سرے سے کوئی بحث ہی نہیں' اس کے تمام عواقب و نتائج کا استحصاء بھی مطلوب نہیں' البتہ ان میں سے چند ایسے امور کا تذکرہ ناگزیر ہے جن کا براہ راست تعلق ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال سے ہے۔

● ان میں سے اہم ترین امر تو یہ ہے کہ اس جنگ کے جو نتائج برآمد ہوئے ان کی بنا پر صدر

ایوب کی سیاسی حیثیت کو شدید دھکا لگا۔ اور ان کا جو ستارہ ایشیا کے ایک عظیم رہنما یا بالفاظِ دیگر ایشیائی ڈیگال کی حیثیت میں عروج کی جانب حرکت کر رہا تھا' مائل بہ زوال ہو گیا۔

● دوسرے یہ کہ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی جو چند سال قبل سے مسلسل ایک خاص رخ پر بڑھتی چلی جارہی تھی ایک انتہا پر پہنچ کر نہ صرف یہ کہ رک گئی بلکہ واپس قدیم سمت میں گردش کرنے لگی -----اور بظاہر احوال بھی اس میں کم از کم اعتدال کا رنگ نمایاں ہو گیا۔

● تیسرے یہ کہ مسلم قومیت کا جو جذبہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد جلد ہی سرد پڑ گیا تھا' اس جنگ کے دوران نہ صرف یہ کہ ایک دم پھر بیدار ہوا بلکہ ایک بار پھر اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا' اگرچہ اس کا یہ زور شور (TEMPO) اب کی بار بھی عارضی ہی ثابت ہوا۔ اور جنگ کے بعد جلد ہی یہ جذبہ پھر سرد پڑنا شروع ہو گیا۔

> پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی اور پاکستانی قومیت دونوں کے اعتبار سے پاکستان کی سیاسیات میں جو مدّ اس جنگ کے دوران آیا تھا' صدر ایوب کو تو اپنی مخصوص ذمہ دارانہ حیثیت کی مجبوریوں کی بنا پر اسے ایک خاص حد تک لے جانے کے بعد واپس جذر کی جانب لوٹنا پڑا----- لیکن ان کے ایک اپنے تربیت دادہ نوجوان ساتھی نے مدّ سے جذر کی جانب رجوع سے انکار کر دیا اور وہ اسی مقام پر کھڑا رہ گیا۔ نتیجتاً اس نے اس مدّ کے لئے علامتی حیثیت اختیار کر لی----- بس یہیں سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اصل ذاتی سیاسی زندگی اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہو گیا!!

۳۔ قدیم سکہ بند احزابِ اختلاف' جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا' ۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کچھ عرصہ تو کچھ اپنی انتخابی شکست کے زخموں کو سہلانے میں مصروف رہیں اور کچھ باہمی اختلافات میں الجھی رہیں۔ اس کے فوراً بعد ۶۵ء کی پاک ہند جنگ واقع ہو گئی جس میں پوری قوم متحد اور یکسو تھی اور اختلاف و افتراق کی گنجائش ہی نہ تھی۔ جنگ کے فوراً بعد اعلانِ تاشقند سے انہیں صدر ایوب کی حکومت کے خلاف عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کا ایک سنہری موقع ہاتھ آیا تھا اور مخالف جماعتوں کے جوشیلے کارکن اس پر مُصر بھی تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

لیکن بعض بزرگ سیاست دانوں نے عوامی ایجی ٹیشن کی تجویز کو رد کر کے ایک پُرامن آئینی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی، عوامی لیگ اور مشرقی پاکستان کے قومی جمہوری محاذ پر مشتمل ایک متحدہ محاذ پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (PDM) کے نام سے معرض وجود میں آگیا۔ جو تقریباً دو سال سے سہل انداز میں اور سبج چال سے لیکن بڑے تسلسل و استقلال کے ساتھ دھیمے دھیمے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک مسٹر بھٹو نے ہنگامہ کھڑا کر کے اسے بالکل نئی صورت حال سے دوچار کر دیا۔

پی ڈی ایم کو اس بات کا کریڈٹ بہرحال دیا جانا چاہئے کہ اس نے تقریباً دو سال تک بحالیٔ جمہوریت کے لئے بڑی مستقل مزاجی سے کام کیا ہے اور اس کے لئے واقعی اور حقیقی محنت کی ہے۔ اور اگرچہ وہ جس شائستہ (SOPHISTICATED) قسم کے طریق کار کی عادی ہے اس سے کسی بھی حکومت کو فوری طور پر خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کجا کہ ایک ملک کی اپنی نوکر شاہی (BEUROCRACY) کی حکومت کو، جو ایک حقیقی عوامی جمہوری حکومت کے سوائے باقی تمام قسم کی حکومتوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے---- تاہم اس میں شک نہیں کہ کم از کم پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پی ڈی ایم کی حالیہ دو سالہ جدوجہد ایسی منظم اور مسلسل اور آئینی و پُرامن جدوجہد کی کوئی دوسری مثال، جماعت اسلامی کی ابتدائی دستوری مہموں کے سوا نہیں ملتی------

اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ PDM کا اصل تنظیمی ڈھانچہ بھی جماعت اسلامی ہی کے سہارے قائم ہے اور اس کی اصل روحِ رواں بھی جماعت اسلامی ہی ہے۔ پی ڈی ایم میں شامل دوسری تمام جماعتیں اور پارٹیاں چند معروف سیاست دانوں کی باہمی ایسوسی ایشنوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ اصل جماعتی تنظیم جس کے بل پر پی ڈی ایم کا سارا کاروبار چل رہا ہے صرف جماعت اسلامی کی ہے۔

> پی ڈی ایم کے بارے میں ایک اور اہم بات جو پیش نظر رہنی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس پر دائیں بازو کے رجحانات کا فیصلہ کُن غلبہ ہے۔ بائیں رجحانات کے حامل صرف نہایت نرم طبع اور معتدل مزاج لوگ ہی اس میں کھپ سکے ہیں اور انہیں بھی جلد یا بدیر اس سے علیحدگی اختیار کرنی ہوگی------ یہ بات بھی نوٹ

کرنے کے قابل ہے کہ اس اعتبار سے بھی اصل علامتی حیثیت اس گروہ میں جماعت اسلامی ہی کو حاصل ہے۔ اور یہ' جیسا کہ ہم بعد میں قدرے تفصیل سے عرض کریں گے' اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے ایک بہت بڑی بدقسمتی کا آغاز ہے۔

۴۔ سوشلسٹ ذہن اور بائیں بازو کے رجحانات مشرقی پاکستان کی حد تک تو کم از کم اتنے ہی "قدیم" ہیں جتنا خود پاکستان' لیکن مغربی پاکستان میں یہ رجحانات زیادہ تر ۶۵ء کی جنگ کے بعد ابھرے ہیں۔ اور گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصے میں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رجحانات تیزی کے ساتھ پھیلے بھی ہیں اور مختلف تنظیمی ہیئتوں کی شکل میں نمودار بھی ہوئے ہیں۔ اس کا ایک سبب ملک کی معیشت میں "صنعتی انقلاب" کے اثرات بھی ہیں' جن سے موجودہ استحصالی نظامِ معیشت کی گھناؤنی صورت کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بیکاری سے بھی ان رجحانات کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری گزشتہ پانچ چھ سال کی خارجہ پالیسی نے بھی' جس کے مدّوجذر کے جانب ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں ان رجحانات کو تقویت دی ہے ---- غرض کہ مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر ہمارے ملک میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی قوت کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں لیکن ان کے اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہو گئی ہے۔ اور اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ عمل کی کوئی واضح صورت تاحال سامنے نہیں آئی' تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (NUCLEUS) ہو گا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو اِس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

۵۔ گزشتہ دو ڈھائی سال کے دوران تدریجاً ایک اور قوت بھی پاکستانی سیاست کے منظرِ عام پر

نمودار ہوئی ہے۔ ہماری مراد جمعیت علمائے اسلام سے ہے جس نے اس عرصے میں رفتہ رفتہ خاصی قوت بہم پہنچائی ہے اور اپنے منتشر اثرات کو خاصے مضبوط تنظیمی سلسلے میں منسلک کر لیا ہے۔ یہ تنظیم اگرچہ اپنی ہیئت اور نوعیت کے اعتبار سے دوسری تنظیموں مثلاً جماعت اسلامی سے بہت مختلف انداز کی ہے (مثلاً اس کے یہاں کاغذی کاروائی اور دفتری نظام شاید بالکل ہی دقیانوسی اور PRIMITIVE طرز کا ہو' لیکن ایک مشترک ذہنی ساخت اور مشترک اندازِ فکر اور اس کے ساتھ ساتھ ایک شاندار ماضی کے ورثے کی بنا پر اس گروہ نے بہت جلد ایک نہایت منظم اور فعال فطری تنظیم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ عوام میں اس کی جڑیں انتہائی زیریں سطحوں (SUBSTRATA) تک گہری اتری ہوئی ہیں۔ دینی مدارس اس کے مستقل مراکز اور اللہ کے گھر اس کے مستقل دفاتر ہیں۔ اس کے عام کارکن ہی نہیں اکابر تک سب خالص عوامی کارکن ہیں۔ سادگی' دینداری اور غایت درجہ خلوص کے ساتھ نہایت زوردار جذبۂ عمل اس کے شعائر ہیں۔ ان تمام چیزوں کے پیش نظر یہ اندازہ قطعاً مبالغہ پر مبنی نہیں ہے کہ آئندہ پاکستان کی سیاست کے میدان میں جمعیت علمائے اسلام نہایت مؤثر رول ادا کرے گی۔

ہم انہی صفحات میں چند ماہ قبل یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ گروہ ذہناً و قلباً خالص حسینیؒ ہے۔ یعنی علمائے دیوبند کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے سرگروہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے۔ اس طرح ان کا تعلق تحریکِ آزادیٔ ہند و استخلاصِ وطن کے اس قدیم و عظیم سلسلے سے جا ملتا ہے جو تحریکِ شہیدینؒ سے شروع ہو کر' ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی سے ہوتا ہوا' اور پھر تحریکِ خلافت اور ریشمی رومالوں کی تحریک ایسی دوسری متعدد چھوٹی چھوٹی کڑیوں سے گزر کر بالآخر جمعیت علمائے ہند پر ختم ہوا تھا۔ اور اس پورے عرصے میں اسلامیانِ ہند کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا رہا تھا۔ آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل مسلمانانِ ہند کی ایک عظیم اکثریت نے اس گروہ کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا جو بالآخر قیامِ پاکستان پر منتج ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اول اول اس طبقے پر شکست کا سا احساس طاری رہا۔ اور ان حضرات نے ایک عرصے تک حلقہ دیوبند کے ان دوسرے اکابر کی سیادت قبول کر کے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کا ساتھ دیا تھا گوشہ عافیت میں پناہ لئے رکھی۔ ۵۳/۵۲ء میں مجلس احرار اسلام نے جو عظیم سیاسی ایجی ٹیشن برپا کیا تھا اس کی پشت پر اصل قوت اسی گروہ کی تھی۔ اس کے فوراً بعد جب پاکستانی سیاست میں انتشار برپا ہوا اور مسلم لیگ

کو فیصلہ کن سیاسی حیثیت حاصل نہ رہی تو اس گروہ نے بھی اپنی حامیٔ مسلم لیگ قیادت کا جوا گردن سے اتار پھینکا اور خالصتاً اپنا اصل اور قدیم رنگ اختیار کر لیا۔

------اُس وقت سے اب تک اندر ہی اندر ان کی تنظیم وسعت اختیار کرتی رہی اور اس کے کارکنوں میں جوش و جذبہ بیدار ہوتا رہا------ گزشتہ سال ان کی جو کانفرنس لاہور میں موچی دروازے کے باہر ہوئی تھی' اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جلد ہی جمعیت پاکستان کی عملی سیاست میں مؤثر طور پر دخیل ہو گی------ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مارشل لاء کے بعد سے جو سکوت و سکون پاکستانی سیاست پر طاری تھا اور لوگ جس طرح سہمے سہمے سے تھے اس میں پہلی ہلچل اور اولین سیاسی سرگرمی جمعیت ہی کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ ہماری مراد اس کامیاب ایجی ٹیشن سے ہے جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب کے خلاف برپا ہوئی تھی اور جس سے چھٹکارا پانے کے لئے حکومتِ وقت کو ڈاکٹر صاحب موصوف کو قربانی کا بکرا بنانا پڑا تھا!

اس گروہ کے بارے میں اہم ترین بات جو نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے اور چاہے اس کا سبب مغربی استعمار سے شدید نفرت کا وہ قدیم جذبہ ہو جو انہیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملا ہے اور گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے' چاہے یہ واقعہ ہو کہ چونکہ یہ خود ایک خالص عوامی قوت ہیں لہٰذا عوام کی دقتوں اور مشکلات کا زیادہ قریبی احساس رکھتے ہیں' اور چاہے یہ ہو کہ ماضی میں ان کا اشتراکِ عمل جس عظیم سیاسی تحریک کے ساتھ رہا ہے (ہماری مراد ماضی کی انڈین نیشنل کانگرس ہے!) اس پر بالعموم سوشلسٹ خیالات کا غلبہ تھا---- سبب یا اسباب خواہ کچھ بھی ہوں بہرحال واقعہ یہی ہے کہ جمعیت علمائے اسلام کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے۔ اور چاہے اس کے اکابرو رہنما خالص اور بے آمیزش اسلام ہی کے علمبردار ہوں' اس کے کارکنوں میں کثیر تعداد ایسے جوشیلے لوگوں کی شامل ہے جو اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند نظری طور پر درست اور بحالاتِ موجودہ عملاً لازمی خیال کرتے ہیں----!

یہی وجہ ہے کہ شرقِ اوسط کی سیاست میں بھی یہ حضرات صدر ناصر کے حامی و مؤید اور شاہ

فیصل کے ناقد و مخالف ہیں ------ اور تازہ سیاسی ہنگامے میں بھی ان کی شرکت اولاً نیشنل عوامی پارٹی اور بھٹو صاحب کی پاکستان پیپلز پارٹی کے شانہ بشانہ ہوئی ہے۔ اس صورت حال کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگلستان سے واپسی پر جب مولانا مودودی نے غیر معمولی گھن گرج کے ساتھ سوشلزم کے حامیوں کو چیلنج کیا تو اس کے جواب میں جمعیت علمائے اسلام کے سرکاری آرگن "ترجمان اسلام" نے "مودودی صاحب کی تازہ گھن گرج" کے عنوان سے تحریر فرمایا کہ :

"لندن کی سرد آب و ہوا سے صحت یاب ہو کر مودودی صاحب پاکستان کے نسبتاً گرم ماحول میں تشریف لا چکے ہیں جس کی گرمی میں کافی اضافہ ان کی غیر حاضری کے دوران کے پیدا شدہ گرم سیاسی موسم نے کر رکھا ہے۔ آپ نے ۳۰/ دسمبر کی شام کو لاہور میں مختلف حصوں سے آئے ہوئے اپنی جماعت کے کارکنوں سے زبردست گھن گرج کے عالم میں فرمایا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تک کسی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ یہاں اسلام کے سوا کسی اور نظام کو لا سکے" ------ مودودی صاحب کی یہ گھن گرج اگر اس دعویٰ کی حقیقتاً حامل ہوتی اور اپنے ان فرمودات کے دوسرے حصوں میں خود ہی انہوں نے اپنی اس "گھن گرج" کی بالمعنی تردید نہ فرمادی ہوتی تو اس اعلان کا خیر مقدم پاکستان کا ہر دین دار مسلمان تہ دل سے کرتا۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ اس ساری "گھن گرج" کا مقصد صرف یہاں پہنچ کر ختم کر دیا گیا کہ "اسلام اور سوشلزم کا پیوند لگانا ممکن نہیں" اور یہ کہ "یہ محمد عربیؐ کی امت کا ملک ہے' یہ مارکس یا ماؤزے تنگ کی امت کا ملک نہیں ہے" ------ سوال یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے پیوند کا انکار کرنے والا اسلام اور برطانوی پارلیمانی نظام کے پیوند کا بھی انکار کیوں نہیں کرتا؟ اور محمد عربیؐ کی امت کے اس ملک کے مارکس اور ماؤزے تنگ کی امت کا ملک ہونے کی نفی کرنے والا اس ملک میں اس برطانوی سیاسی نظام کی بحالی کی جدوجہد میں کیوں مصروف ہے جو گلیڈسٹون' لائڈ جارج' چرچل وغیرہ کا تراشیدہ اور رائج کردہ ہے؟ آخر اسلامی نظام کے قیام کی یہ بلند بانگ صدا صرف سوشلزم کے ہی مقابلہ میں کیوں اتنی "گھن گرج" دکھاتی ہے اور کیوں برطانوی پارلیمانی نظام کی حمایت میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے' حتیٰ کہ اس نظام کے ہر چھوٹے بڑے جزو کو بھی قبول کرتی چلی جاتی ہے"۔ (ترجمان اسلام' ۱۰/ جنوری ۶۹ء)

الغرض ایک مدتِ طویل کے حبس کے بعد جو طوفانی کیفیت گزشتہ ڈھائی تین ماہ کے دوران پاکستانی سیاست کے میدان پر طاری رہی تھی' اس کے مدھم پڑتے ہی جو نئی صورت حال سامنے آئی ہے اور گزشتہ چند سالوں سے جو رجحانات زیرِ سطح تقویت پاتے رہے ہیں ان کے ایک دم سطح پر آ جانے سے سیاست کی جو تازہ بساط پاکستان میں بچھی ہے' اس کا مختصر نقشہ یہ ہے :

۱۔ جہاں تک حکومتِ وقت کا تعلق ہے وہ کچھ ایک فرد کی ذاتی شخصیت کے سہارے اور زیادہ تر نوکرشاہی کے بل پر قائم ہے۔ اس کی عوامی و سیاسی جڑیں اول تو کوئی ہیں ہی نہیں' اور جو ہیں ان کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ ان اضافی جڑوں (ADVENTITIOUS ROOTS) کی سی ہے جو بعض درختوں (مثلاً برگد) کی شاخوں سے اتر کر زمین میں پنجے گاڑ لیتی ہیں اور درخت کے پھیلاؤ کے لئے اضافی سہاروں کا کام دیتی ہیں۔

۲۔ پاکستانی سیاست کا وہ دور اب گزر چکا جب سیاست صرف اصحابِ دولت و ثروت کے مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی اور گنتی کے چند جاگیردار اور سرمایہ دار (جن میں تازہ اضافہ بعض نو دولتیے صنعت کاروں کا ہوا تھا) اس پر کامل اجارہ داری رکھتے تھے۔ اب یہاں عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو گیا ہے اور وہ دور قریب آیا چاہتا ہے جس کی خبر علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں دی تھی کہ ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشہ دکھا کر مداری گیا

۳۔ پاکستان کی موجودہ بساطِ سیاست کے عناصرِ اربعہ حسب ذیل ہیں : ایک دائیں بازو کے قدیم خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان جو اکثر و بیشتر زمینداروں اور سرمایہ داروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ اس وقت متعدد سرکاری و غیر سرکاری لیگوں میں منقسم ہیں لیکن درحقیقت ملتِ واحدہ ہیں اور کسی بھی وقت ؏ "آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک" کے مصداق باہم متحد ہو سکتے ہیں۔ (کنونشن لیگ اور کونسل لیگ تو خالص ہم جنس ہیں ہی' عوامی لیگ میں البتہ لیگی الاصل عناصر کے ساتھ ساتھ بعض حقیقی عوامی عناصر بھی شامل ہیں' لیکن سیاست کی موجودہ تیز رفتاری کے پیش نظر ان کا جلد ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا قطعی ہے) دوسرے' دائیں بازو

کی مضبوط مذہبی جماعت--- جماعت اسلامی ----- تیسرے 'بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں جن میں سے کچھ فی الوقت پی ڈی ایم (یا تازہ تر ڈی 'اے 'سی) میں شامل ہیں اور کچھ اس کے باہر ہیں۔ اور ----چوتھے 'بائیں بازو کی مذہبی جماعت---- جمعیت علمائے اسلام {۳}

۴۔ پاکستان کی آئندہ سیاسیات کا اصل محور (AXIS) دائیں اور بائیں بازوؤں کے رجحانات کا تصادم ہو گا {۴} اور متذکرہ بالا موجودہ بساطِ سیاست میں جو گروہ بندیاں اس محور کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہیں یا ابھی قائم ہو رہی ہیں وہ جلد یا بدیر ٹوٹ کر رہیں گی اور نئی صف بندی (ALIGHNMENT) اسی محور کے گرد ہو گی۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ حذر لیکن قطعاً یقینی امر یہ ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کی بیرونی قوتیں بھی اب پاکستانی سیاست میں پہلے سے کہیں زیادہ دخیل ہوں گی اور اپنے اپنے مفادات کے تحفظ اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کے دفاع اور ان میں توسیع کے لئے زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک اثر انداز ہونے کی کوشش کریں گی۔

۵۔ ہمارے نزدیک اس وقت ملک کی داخلی سیاست کے اصل بنیادی مسائل دو ہیں : ایک یہ کہ سیاسی اختیارات ----- جو مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر عوام کے بجائے نوکر شاہی کے قبضے میں چلے گئے ہیں 'وہ اختیار و اقتدار کے اصل مالکوں یعنی جمہور کو منتقل کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ دولت اور خصوصاً ذرائع پیداوار جو عوام الناس کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بن گئے ہیں انہیں پوری قوم میں عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے ----- گویا کہ پہلی "سلطانیٔ جمہور"

{۳} رہے بعض وہ "تازہ واردانِ" بساطِ سیاست جو آزاد سیاست دانوں کی حیثیت سے دنگل میں شریک ہوئے ہیں تو اس سے قطع نظر کہ ہمارے نزدیک ان حضرات کی کوئی واقعی سیاسی اہمیت نہیں ہے اور ان میں سے بعض کا جو شاندار استقبال ہوا ہے وہ بھی ہمارے نزدیک پاکستانی قوم کے ایک طبقے کے سیاسی افلاس کا مظہر ہے۔ چونکہ وہ تقریباً سب کے سب دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ہم انہیں میدان سیاست کا پانچواں سوار بھی تسلیم نہیں کرتے 'بلکہ متذکرۃ الصدر عناصرِ اربعہ میں سے پہلے عنصر ہی کا ضمیمہ سمجھتے ہیں!

{۴} جس کی ایک ناخوشگوار ابتدا علاہور اور کراچی میں دائیں بازو کی انتہائی جماعت جماعت اسلامی اور بائیں بازو کے انتہا پسند لوگ یعنی پی پی پی کے کارکنوں کے سر پھٹول کی شکل میں ہو چکی ہے۔

کے نظام کے واقعی اور حقیقی نفاذ کی کوشش ہے اور دوسری "دورِ سرمایہ داری" کے منحوس اثرات اور نقوشِ کہن کو مٹانے کی سعی وجہد ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی کوششیں درست بھی ہیں اور مبارک بھی! اور ملک کے ہر ذی شعور شہری کا فرض ہے کہ وہ ان میں اپنی اپنی صلاحیت، استعداد اور قوتِ کار کے مطابق حصہ لے۔ اسلام کے نزدیک یہ دونوں ہی مقاصد محمود ہیں۔ اسلام ایک طرف اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ بندگانِ خدا کی گردنوں پر کوئی ایک فرد یا کچھ افراد یا کوئی مخصوص طبقہ خدائی کا تخت جما کر بیٹھے،----اور دوسری طرف عدل وانصاف پر بھی انتہائی زور دیتا ہے۔ چنانچہ "وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ"{۵} آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں سے ہے اور "لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ"{۶} کتابِ الٰہی کا مقصدِ نزول ہے اور "دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ"{۷} کی کوئی صورت اسلام کے نزدیک کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں!

لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں اس وقت ان دونوں ہی میں شدید افراط وتفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ دائیں بازو کے اہلِ سیاست نے صرف پہلے کام پر نگاہوں کو مرکوز کر دیا ہے اور دوسرے معاملے کے ضمن میں وہ "وعدۂ فردا" سے آگے قدم بڑھانے کو تیار نہیں، اور مزید بدقسمتی یہ کہ "سلطانیٔ جمہور" کے ذیل میں بھی ان کے سارے تصورات یورپ کے مبنی بر الحاد فکر سے مستعار لئے ہوئے ہیں--------دوسری طرف بائیں بازو کے حامی لوگوں نے اپنی اصل توجہ دوسرے کام پر مرکوز کر دی ہے اور "عدلِ اجتماعی" کے لئے نظام بھی ان کے پیشِ نظر خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ کا عطا کردہ نہیں، مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ کا وضع کردہ ہے-----!!

{۵} "اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین انصاف کروں"۔ (الشوریٰ : ۱۵)

{۶} "تاکہ لوگ عدل وانصاف کے نظام پر قائم رہیں" (الحدید : ۲۵)

{۷} "(سرمائے) کا الٹ پھیر تمہارے اہلِ ثروت ہی کے مابین"۔ (الحشر : ۷)

اس صورت حال میں ہر اس شخص کے لئے جو اول و آخر صرف مسلمان ہو اور جس کے نزدیک دین و مذہب ہر چیز پر مقدم ہوں، ایک اہم لمحہ فکریہ ہے--- ایسے سب لوگوں کو، خواہ وہ موجودہ سیاسی سرگرمی میں کسی حیثیت سے شریک ہوں، خواہ کسی خالص غیر سیاسی کام میں مصروف ہوں، اس صورت حال کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہئے اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے مدِ نظر دین کے احیاء اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے مناسب لائحہ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہو جانا چاہئے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

(۲)

فروری ۱۹۶۹ء

گزشتہ ماہ کا "تذکرہ و تبصرہ" ہم نے اس نسبتاً پر سکون وقفے کے دوران تحریر کیا تھا جو پاکستانی سیاست کے میدان میں پہلی طوفانی ہلچل کے بعد کچھ دنوں کے لئے آیا تھا۔ اور اگرچہ ہم نے اس وقت کی سکون آمیز کیفیت کے بارے میں اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ "عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو!" تاہم واقعہ یہ ہے کہ ہمیں قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس قدر فوری طور پر ایک دوسرا طوفان آجائے گا جس کی تیزی و تندی سابقہ تمام ریکارڈ توڑ ڈالے گی!

بہرحال، متوقع یا غیر متوقع، طوفان کا یہ دوسرا ریلا تھا بہت سخت، جس میں معاملہ جلسوں، جلوسوں، مظاہروں، لاٹھی چارج اور اشک آور گیس کے استعمال سے بہت آگے نکل کر عوام کی طرف سے توڑ پھوڑ، لوٹ مار، آتش زنی و خشت باری بلکہ بعض مقامات پر مہلک ہتھیاروں کے استعمال تک---اور حکومت کی جانب سے پولیس کی فائرنگ، فوج کی طلبی اور کرفیو کے نفاذ تک جا پہنچا۔ چنانچہ مشرقی و مغربی پاکستان کے درجن بھر بڑے بڑے شہروں میں مسلسل کئی روز تک لاقانونیت کا دور دورہ رہا اور شہری زندگی پر کامل تعطل کی کیفیت طاری رہی---اور اگرچہ ان سطور

کی تحریر کے وقت صورتحال یہ ہے کہ بالعموم حالات پر قابو پایا جا چکا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ فوج کی آمد اور کرفیو کے نفاذ کے بعد کسی جگہ سے بھی کسی خاص واقعے یا حادثے کی اطلاع نہیں ملی' چنانچہ اکثر مقامات سے کرفیو اٹھایا بھی جا چکا ہے' تاہم حالات کسی طرح بھی اطمینان بخش قرار نہیں دیئے جا سکتے اور عین ممکن ہے کہ کچھ وقفے کے بعد دوبارہ ناخوشگوار واقعات کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

ہم نے گزشتہ ماہ بھی عرض کیا تھا---- اور پھر اعادتاً عرض ہے کہ ہمیں ملک کی سیاست سے براہ راست کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ع "ہر کسے را بہر کارے ساختند!" کے مصداق ہمارا مزاج ہی سیاست سے موافقت نہ رکھتا ہو اور ہم اپنی افتادِ طبع کے باعث اس سے بُعد محسوس کرتے ہوں۔

لیکن جہاں تک ہماری شعوری سوچ کا تعلق ہے' اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمیں اصل دلچسپی دین و مذہب سے ہے اور ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ اگرچہ ہماری ملکی سیاست کے میدان میں مسلسل دین و مذہب کا نام لیا جاتا رہا ہے اور اِس وقت بھی دو مضبوط مذہبی گروہ پاکستانی سیاسیات میں برسرکار ہیں' حقیقت یہ ہے کہ نہ ہماری موجودہ ملکی سیاست کا کوئی تعلق اسلام سے ہے' اور نہ ہی گزشتہ اکیس سال کے دوران کبھی دین و مذہب کو پاکستان کی سیاست میں کسی مؤثر عامل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

بایں ہمہ---- چونکہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش سے بالکل لاتعلق نہیں رہ سکتا اور ملک و ملت کے مسائل تو بہت اہم ہیں' گلی اور محلے کے معاملات سے بھی کسی انسان کے لئے قطعاً لاتعلق رہنا ممکن نہیں' لہٰذا گزشتہ ماہ بھی ہم نے ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال کا اپنے نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا تھا اور اپنے فہم کی حد تک موجودہ سیاست کے حدود اربعہ کے تعین کی کوشش کی تھی---- اور اس ماہ بھی ہم اپنی رائے' جو خالصتاً ملک و ملت کی خیر خواہی اور قوم و وطن کی نصح و ہمدردی پر مبنی ہے' پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاست سخت تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ہے اور ملک و ملت کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ جماعتی سیاست کے تقاضوں سے بلند تر ہو کر خالص ملی و قومی سطح پر غور و فکر کریں اور اس پیچیدہ صورتحال کو جلد از جلد سلجھانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ سیاسی ایجی ٹیشن کے اس دوسرے ریلے میں لاقانونیت اور انارکی کا رنگ غالب تھا اور اگرچہ تمام مخالف جماعتوں نے تخریبی سرگرمیوں کی ذمہ داری سے اظہارِ براءت کیا ہے اور توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کی ساری ذمہ داری کسی قدر غنڈہ عناصر پر اور زیادہ تر خود حکام کے غلط اقدامات پر ڈالی ہے اور یہ الزام بھی لگایا ہے کہ یہ ساری کارروائی حکام نے سخت تر اقدامات کا جواز مہیا کرنے کے لئے از خود اپنے ایجنٹوں سے کرائی ہے' تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ عوامی سطح پر سیاسی شعور اور جماعتی تنظیم کی ابھی ہمارے یہاں بہت کمی ہے اور اپوزیشن کسی طرح بھی اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ قوم کی ایک ایسی واضح اکثریت کا اعتماد و تعاون اسے حاصل ہے کہ وہ اپنی سیاسی تحریک کو طے کردہ خطوط پر چلانے اور اسے کوئی غلط رخ اختیار کرنے سے روکنے پر قادر ہے۔

آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے ایک مرتبہ اپنی سیاسی تحریک کو عین عروج کے موقع پر محض اس بنا پر ایک دم بند کر دیا تھا کہ ایک مشتعل ہجوم نے ایک تھانے پر حملہ کر دیا تھا اور اس کے باوجود کہ ان کے تمام اہم رفقاء اس پر سخت برہم ہوئے تھے اور مُصر تھے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں' وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے تھے اور گویا ان کا موقف یہ تھا کہ ایسے واقعات کا ظہور ہماری سیاسی پوزیشن کی کمزوری اور عوام پر ہماری گرفت کی کمی کا ثبوت ہے۔ اور ہمیں ابھی۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

کے مصداق عوامی تحریک چلانے سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی توجہات عوام کے سیاسی شعور کی تربیت اور عوامی تنظیم کے استحکام پر مرکوز کر دینی چاہئیں۔

ہمارے یہاں' جیسا کہ ہم نے گزشتہ ماہ بھی عرض کیا تھا' اس وقت عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ بالکل شروع ہی سے سیاست کے میدان میں صحت

مندروایات قائم ہوتی چلی جائیں اور مختلف الخیال عناصر اپنی اصل توجہ رائے عامہ کو بیدار کرنے اور اپنی جماعتی تنظیم کو مستحکم کرنے پر صرف کریں۔ ہلڑبازی اور ہنگامہ آرائی میں کسی کی بھی خیر نہیں ہے اور تخریبی سرگرمیوں سے موجودہ حکومت ہی کو پریشانی نہیں ہوگی، بلکہ اگر یہ عادت پختہ ہوگئی تو آئندہ بھی ہر حکومت کو مسلسل دِقّت کا سامنا رہے گا۔ ہمارا سیاسی شعور ابھی بہت کچھ پختگی کا محتاج ہے اور اس نیم خام اور نیم پختہ حالت میں اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ تمام محبِّ وطن اور محبِ قوم عناصر پوری طرح ہوشیار رہیں۔ مبادا ملک و ملت کے دشمن انارکی کے پردے میں قوم و وطن کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

خاص طور پر طلبہ کا مسئلہ اس وقت نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے، ان میں عام بے چینی اور اضطراب کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں، اور یہ مسئلہ صرف ہمارے ملک کا ہی نہیں پوری دنیا کا ہے۔ تہذیب جدید نے انسان کو روحانی قدروں سے جس طرح بیگانہ کیا ہے اور اخلاقی معیارات جتنی تیزی سے پست ہوئے ہیں اس کا مظہرِ اتم بہرحال نوجوان نسل ہی کو ہونا چاہئے اور کسی اعلیٰ نصب العین کے فقدان کے باعث جو مہیب خلا انسانی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے اس کا سب سے نمایاں اثر بھی نوجوان طلبہ ہی میں نظر آنا چاہئے۔ ان پیچ در پیچ اسباب کی بنا پر پوری دنیا میں نوجوان طلبہ کے طبقے کی کیفیت بالکل بارود کی سی ہے جو ذرا سی چنگاری سے بھڑک اٹھنے کو تیار ہوتا ہے۔ پھر خاص طور پر زیر ترقی ممالک کے اپنے مخصوص مسائل ہیں جن سے طلبہ کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوتا ہے---- چنانچہ ہمارے یہاں بھی یہ طبقہ ع "دیوانہ را ہوئے بس است!" کے مصداق گویا منتظر ہی تھا کہ کہیں سے کوئی صورت ایجی ٹیشن کی پیدا ہو اور یہ اس میں کود پڑیں۔

گزشتہ چند سالوں کے دوران ہماری حکومت نے طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں پر جو پابندیاں عائد کئے رکھی ہیں ان سے بھی ان کے اندر ہی اندر ایک لاوا پکتا رہا ہے جسے بہرحال ایک نہ ایک دن پھٹنا تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حالیہ سیاسی ایجی ٹیشن میں اصل زور شور طلبہ ہی کا پیدا کردہ ہے اور موجودہ سیاسی ہماہمی ان ہی کی رہینِ منّت ہے۔ تین ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ یونیورسٹیاں اور کالج بند ہیں اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ قطعاً معطل پڑا ہے۔ اور اب بھی اگرچہ کچھ کالج کھل گئے ہیں بہت

سے طالب علم کلاسوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں اور اس کے باوجود کہ ان کے کچھ مطالبات تسلیم بھی کئے جا چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے گویا ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں لیکن ان کا ایجی ٹیشن علیٰ حالہٖ قائم ہے اور نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی کمی نہیں آ رہی بلکہ ان کے مطالبات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے--- حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے طلبہ نے تو اپنے مطالبات میں تمام سیاسی طبقات کے جملہ مطالبات کو شامل کر لیا ہے۔

یہ صورتحال بھی متقاضی ہے کہ ملک و ملت کے بہی خواہ اس پر اپنے اپنے جماعتی و گروہی نقطہ ہائے نظر سے نہیں بلکہ قومی و ملی نقطۂ نظر سے سوچیں۔ جو سیاسی حلقے طلبہ کو اپنے پیش نظر سیاسی انقلاب کے لئے استعمال کرنے کی کوشش میں ہیں' وہ درحقیقت آگ سے کھیل رہے ہیں اور انہیں کسی طرح قوم اور وطن کا بہی خواہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سیاست اصلاً ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو تعلیم سے فارغ ہو کر ملک کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ طلبہ کا اصل کام یہ ہے کہ اپنے زمانۂ تعلیم میں آئندہ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کریں۔ اسی تعلیم و تربیت کا ایک جزو یقیناً سیاسی شعور اور ملکی و قومی مسائل کی سوجھ بوجھ بھی ہے' لیکن دورانِ تعلیم کسی سیاسی دھڑے کا آلہ کار بننا طلبہ کے لئے اپنے مستقبل کے اعتبار سے بھی نقصان دہ ہے اور ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبارات سے بھی سخت مضر ہے۔

اس تازہ ایجی ٹیشن پر صدر ایوب کا ردِّ عمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لئے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورتحال کو صرف "بعض شرپسند لوگوں" کی جانب منسوب کر کے تشدد کی راہ اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہرحال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے انہوں نے یقیناً دانشمندی کا ثبوت دیا ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہئے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی صاف محسوس ہو رہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کئے رکھا ہے اور جس نہج پر اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے' اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی

عنصر کے لئے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں، انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے۔ معاملہ جو بھی ہو سکتا ہے، دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہو سکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں---- لہٰذا پہلا خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جدوجہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی--- پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جتھوں کا مجموعہ ہے، مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند در چند وجوہ کی بنا پر صدر ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لئے بھی بہت مشکل ہو گئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ ع "آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک" کی سی کیفیت سے بغل گیر ہو جانا چاہئے۔

تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے، جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود پورا ہو گا---- اور انتشار، لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر، ہمارے نزدیک فی الوقت ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح تر بھی ہے۔

اس مقصد کے لئے اس وقت خاص طور پر ایسے لوگوں کو میدان میں آنا چاہئے جو تحریک مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہے تھے، لیکن بعد میں مختلف اسباب کی بنا پر میدان سیاست سے ہٹتے اور گوشہ گیر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ اس وقت نہ کونسل لیگ سے وابستہ ہیں نہ کنونشن لیگ سے---- متحدہ ہندوستان جب انگریز کی غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا تو بارہا ایسا ہوتا تھا کہ جب حکومتِ وقت اور تحریکِ آزادی کی علمبردار جماعتوں کے مابین کسی مسئلے پر ڈیڈ لاک ہو جاتا تھا تو کچھ ایسے لوگ حرکت میں آتے تھے جو اپنی نرم طبیعت اور دھیمے مزاج کی بنا پر سرکار دربار میں بھی رسائی رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی مخلص محبِ وطن بھی تھے۔ ایسے لوگ اگرچہ نہ تاریخ تحریکِ

آزادی میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں نہ ہی عوام نے انہیں کبھی اپنا ہیرو تسلیم کیا۔ تاہم اصحابِ فہم وبصیرت جانتے ہیں کہ حصولِ آزادی کی جدوجہد میں انہوں نے بھی ایک مثبت کردار ادا کیا ہے ---- ہماری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ ہماری ملکی سیاست کی موجودہ پیچیدہ صورتحال بھی کچھ ایسے ہی لوگوں کے ناخنِ تدبیر سے سلجھ سکتی ہے ---- اور اگر ایسے لوگ اس مرحلے پر سامنے نہ آئے تو اندیشہ ہے کہ صورتحال پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جائے گی اور انتشار بڑھتا چلا جائے گا جس سے پاکستان کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

یہ تو ہے موجودہ پیچیدہ صورتحال کا فوری حل ---- باقی جہاں تک پاکستان کی موجودہ سیاست کے مستقل خطوط کا معاملہ ہے اس کے ضمن میں جو تجزیہ ہم نے گزشتہ ماہ ان صفحات میں پیش کیا تھا' ہمیں خوشی ہے کہ قارئینِ "میثاق" نے بھی بالعموم اس سے اتفاق کا اظہار کیا اور بعد کے بعض حالات وواقعات سے بھی ان کی مجموعی حیثیت سے تائید وتوثیق ہوئی۔

یہ بات اب مزید واضح ہو گئی ہے کہ آئندہ اس ملک کی سیاست کا اصل محور دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کا تصادم ہو گا۔ موجودہ حکومت بھی واضح طور پر دائیں بازو کی جانب جھک چکی ہے اور پی ڈی ایم کے اکثر عناصر بھی واضح طور پر اسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ گویا پی ڈی ایم اِس وقت حقیقی و واقعی اپوزیشن نہیں' مصنوعی اپوزیشن ہے جس کا موجودہ حکومت سے اصل اختلاف نظریات پر نہیں ذاتیات پر مبنی ہے جس پر بعض فروعی دستوری اختلافات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے ---- لہٰذا بساطِ سیاست کے موجودہ نقشے میں بہت جلد تبدیلیاں واقع ہوں گی اور پھر اس ملک کی سیاست کی اصل بساط بچھے گی جو دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم پر مبنی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈی اے سی کے نام سے جو وسیع تر اتحاد وجود میں آیا تھا وہ مستحکم ہونے سے پہلے ہی بکھرتا نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ سابق سندھ کے بعض مقامات پر جب ڈی اے سی کے تحت جلوس نکالنے کی کوشش کی گئی تو بعض نعروں اور کتبوں کی عبارتوں پر شدید اختلاف ہو گیا' چنانچہ ڈی سی اے کی صرف چار جماعتیں اس میں شریک ہو سکیں اور بقیہ چار نے علیحدگی اختیار کی۔

دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے حامل ---- اور مغربی طرز کی سرمایہ دارانہ جمہوریت

اور سوشلزم و کمیونزم کے حامی عناصر کی اس باہمی ٹکر میں ہمیں اندیشہ ہے کہ اسلام کا نام خواہ مخواہ لیا جائے گا جس سے کسی فریق کو تو شاید نہ کوئی نفع پہنچے نہ نقصان، لیکن اسلام کو یقیناً نقصان پہنچے گا۔

حال ہی میں جمعیت علمائے اسلام کی پاکستان میں نشاۃِ ثانیہ کے اصل معمار مولانا غلام غوث ہزاروی کے ایک بیان پر جو لے دے ہوئی ہے اس سے یہ بحث زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی ہے کہ آیا سوشلزم کا اسلام کے ساتھ پیوند لگ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گزشتہ شمارے میں جمعیت کے بارے میں جو تفصیلی رائے پیش کی تھی، مولانا غلام غوث صاحب کے اس بیان سے اس کے اہم ترین جزو کی تصدیق ہو گئی۔ مولانا کے اس بیان کا اصل تعاقب حلقہ دیوبند ہی کے ان علماء کی جانب سے ہوا ہے جنہوں نے ماضی میں تحریکِ مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ ان حضرات کی ہمارے دل میں واقعتاً بڑی عزت ہے، لیکن انہوں نے سوشلزم کو اسلام کی عین ضِد اور جمہوریت کو عین اسلام ثابت کرنے کے لئے جس قسم کے دلائل دیئے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگوں کی جانب سے اور ایسی بچگانہ باتیں!

> اسلام بلاشبہ اپنی ذات میں ایک مکمل نظام ہے اور اساسی عقائد و نظریات سے لے کر حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کی تفصیلی تشکیل تک اس کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے جو کسی دوسرے نظریئے یا نظام کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا۔

چنانچہ نہ اس کے کسی جزو کا پیوند کسی اور نظام کو لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور نظام کے کسی جزو کی پیوند کاری اس کے ساتھ ممکن ہے۔ لیکن اگر اس بنا پر کہ اس کے سیاسی و انتظامی ڈھانچے کے بعض اجزاء جمہوریت کے بعض اجزاء سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں، اس کا تعلق جمہوریت کے ساتھ قائم کیا جا سکتا ہے تو یقیناً اس کے معاشی نظامِ عدل و قسط کے بھی بعض اجزاء سوشلزم کے بعض اجزاء سے مطابقت رکھتے ہیں اور اس بنا پر اسلام کا رشتہ سوشلزم کے ساتھ بھی ممکن ہے---- بلکہ ہمیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ خلافتِ راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں اختیارات کا جس قدر ارتکاز تھا اس سے مشابہت کی بنا پر آمریت کا رشتہ بھی اسلام کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے---- اسلامی نظامِ معیشت و حکومت کا عروج یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اور اس میں جہاں جمہوریتِ کاملہ کے ایسے مظاہر دیکھنے میں آتے تھے کہ ایک عام مسلمان ان کو برسرِ منبر ٹوک دیتا تھا وہاں ان کے سفرِ بیت المقدس میں سوشلزم کی بلند ترین منزل کی شان بھی موجود ہے۔

ویسے ہمارے نزدیک' ان دونوں ہی کے ساتھ اسلام کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا نرا تکلّف ہے۔ ہمارے یہاں نہ حامیانِ جمہوریت' جمہوریت کے داعی اس لئے بنے ہیں کہ انہیں اسلام کی بارگاہ سے اس کا حکم ملا ہے اور نہ ہی سوشلزم کے حامی اس کی جانب اس لئے جھکے ہیں کہ انہیں اسلام کا تقاضا یہی معلوم ہوا---یہ سب کچھ تو تاریخ کے ایک عام بہاؤ کے تحت ہو رہا ہے جو گزشتہ دو تین صدیوں سے خالصتاً غیر مذہبی و لادینی رخ پر بہہ رہا ہے اور جس میں مذہب سے سرے سے کوئی بحث (Reference) ہی نہیں! حامیانِ دین و مذہب کی اس عام بہاؤ کے زیر اثر پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کو پیشمہ دینے کی کوشش بالکل خواہ مخواہ ہے------!

موٹی سی بات ہے کہ فکر و فلسفے کے اعتبار سے موجودہ پوری دنیا کا امام تا حال یورپ ہے۔ اور جو خالص بے خدا و مادہ پرستانہ تہذیب وہاں سے اٹھی تھی وہ تا حال پورے کرۂ ارضی پر حکمران ہے۔ وہاں کے ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (Feudal System) کی کوکھ سے خالص تاریخی عوامل کے زیر اثر جو جمہوری نظام برآمد ہوا تھا' اس نے اولاً سیاسی شعبۂ زندگی میں جمہوریت (Democracy) کی صورت اختیار کی جس کے مختلف ممالک میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے۔ اسی جمہوریت نے بعد میں معاشی نظام میں آزاد معیشت کی راہ سے سرمایہ داری (Capitalism) کی کریہہ صورت اختیار کر لی' جس کا ردِّ عمل سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا' جو درحقیقت نظریہ و فکر کے اعتبار سے اسی قدیم لادینی مادہ پرستانہ سلسلۂ فکر کی اگلی منطقی کڑی اور نظام کے اعتبار سے سرمایہ داری کا قدرتی ردِّ عمل ہے---اس رد عمل کے بھی مختلف ملکوں میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے اور اس میں مادر پدر آزاد معیشت کی تباہ کاریوں کی روک تھام میں انسان نے ایک دوسری انتہا پر پہنچ کر فرد کی آزادی کو بالکل سلب کر کے اسے اجتماعیت کے کاملۃً بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ اس کے باوجود چونکہ اس صورت میں بھی انسان اپنے اوپر کسی اور بالاتر اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا' لہٰذا سوشلزم کے تمام ایڈیشن بھی چاہے وہ روسی ہوں یا چینی' مدعی جمہوریت ہی کے ہیں ---چنانچہ اس وقت عالمی کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ملک بھی "عوامی جمہوریہ چین"

ہی کہلاتا ہے---!!

سیاسی و معاشی نظاموں کے انقلابات کا یہ سلسلہ اولاً تو صدی ڈیڑھ صدی میں تکمیل کو پہنچا تھا' لیکن اب دنیا کے تمام زیر ترقی ممالک میں یہ داستان بڑی تیزی کے ساتھ دوہرائی جا رہی ہے اور یہ حالات کا ایک خالصتاً اپنا رخ ہے جو کسی مرحلے پر بھی دین و مذہب سے کوئی فتویٰ طلب نہیں کرتا۔ مفتیانِ دین و مذہب خواہ مخواہ اس کے مختلف موڑوں پر اپنے دار الافتاء سے فتوے صادر کرنے کا تکلف کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان بھی ایک نیم ترقی یافتہ اور نیم پسماندہ ملک ہے اور اس میں بسنے والے عوام بھی ایک نیم خوابیدہ و نیم بیدار قوم ہیں۔ اس نیمے دروں و نیمے بروں حالت میں جتنے دوسرے ممالک مبتلا ہیں' عام اس سے کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم' جو کچھ وہاں ہو رہا ہے وہی یہاں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے ---- اور ہوتا رہے گا جب تک کہ دین و مذہب اس معاشرے میں واقعتاً ایک مؤثر عامل کی حیثیت اختیار نہ کر لیں---- جس کے امکانات بحالاتِ موجودہ دُور دُور تک نظر نہیں آتے!!

ہمارے اس وقت کے جملہ اجتماعی مسائل کی اصل صورت یہ ہے کہ :

۱ ۔ آج سے اکیس سال قبل آزادی کی صورت میں دفعۃً جو سیاسی حقوق و اختیارات ہمارے ہاتھ آئے ہم بحیثیتِ قوم اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ اور چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ یہ حقوق و اختیارات عوام کے ہاتھوں تک کبھی پہنچے ہی نہیں' بیچ ہی میں کچھ جاگیرداروں (Feudal Lords) اور کچھ سابق حکمرانوں کی تربیت داده سروسز (Services) نے انہیں اچک لیا' خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ چونکہ عوام اس کے لئے تیار نہ تھے لہٰذا رفتہ رفتہ یہ اختیارات پہلے چند پیشہ ور سیاست دانوں اور پھر ان کے بھی نااہل ثابت ہو جانے پر کلیۃً سروسز کو منتقل ہو گئے' دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور اس کا ردِ عمل عوامی جمہوریت کی بحالی یا از سرِ نو قیام کی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے!

۲ ۔ آزادی کے وقت ہمارا ملک ایک خالص زرعی ملک تھا اور ان اکیس سالوں کے دوران رفتہ رفتہ صنعت نے ترقی کی' تا آنکہ اب ہم ایک نیم زرعی و نیم صنعتی ملک بن چکے ہیں۔

لیکن چونکہ یہ سارا کام مغرب سے مستعار لئے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے تحت ہوا ہے لہٰذا ہمارے یہاں بھی سرمایہ داری اپنی کریہہ ترین صورت میں ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ چنانچہ ملک کی زرعی دولت پر جو اجارہ داری پہلے سے قائم تھی اس میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملک کی پوری صنعت و تجارت پر بھی چند خاندانوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔۔۔۔اس کے ردِ عمل کے طور پر یہاں بھی وہی کچھ سوچا جا رہا ہے جو دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں سوچا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ تقسیمِ دولت اور ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کے پورے نظام کو بیخ و بُن سے اکھیڑ ڈالا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں ردِ عمل تاریخ کے متذکرہ بالا عمومی بہاؤ ہی کے اجزا ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں!!۔۔۔۔۔!!

لیکن چونکہ اتفاقاً ہمارے ملک کے عوام کو مذہب سے ایک جذباتی سا تعلق بھی ہے' لہٰذا اس غریب کا نام خواہ مخواہ اچھالا جاتا ہے۔ خود تحریک پاکستان کے دوران بھی' جس کے اصل اساسی عوامل معاشرتی و معاشی تھے' اس کا نام زور شور سے لیا گیا اور پاکستان کا مطلب ہی "لا الٰہ الا اللّٰہ" بتایا گیا' جس کی حقیقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ رُبع صدی گزر جانے کے باوجود اس غریب اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نام نشان یہاں نظر آتا ہے جتنا ہندوستان کے مسلمانوں میں' بلکہ ہمارے اندازے کے مطابق اس سے بھی کم۔۔۔۔اور اب بھی مختلف عمرانی نظریات کے حامل لوگ خواہ مخواہ اس کا نام بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔۔۔۔!!

جمعیت علمائے اسلام کا ذکر تو اِس وقت رہنے دیجئے۔ اس لئے کہ وہ پاکستانی سیاست کے میدان میں فی الحال نووارد ہے اور ابھی اس کی سیاست کے خطوط بالکل مبہم ہیں۔ چنانچہ وہ کبھی این اے پی اور پی پی پی کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور کبھی پی ڈی ایم سے اشتراک کرتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک پلڑے میں وزن ڈالتی ہے کبھی دوسرے میں۔۔۔۔!!

البتہ جماعت اسلامی اس لئے قابل ذکر ہے کہ اسے پاکستان کی سیاسیات میں برسرِ عمل ہوئے پورے اکیس سال بھی ہو چکے ہیں اور اس پورے عرصے میں وہ اس امر کی مدعی بھی رہی ہے کہ اس کا اصل مقصد احیائے اسلام اور اقامتِ دین ہے!!

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس پورے سفر کے دوران اس کی دینی و مذہبی حیثیت اگر کوئی تھی بھی تو کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ موڑنے کی بجائے خود متذکرہ بالا تاریخی بہاؤ کے رخ پر بہہ نکلی ہے----!! اور اب چاہے ایک مضبوط اور منظم گروہ کی حیثیت سے ملکی سیاست کے میدان میں اس نے اپنا کوئی وقار قائم کر بھی لیا ہو، دینی و مذہبی حیثیت سے اس کی سرے سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی---!

پاکستانی سیاست کے افق پر اول اول جماعت اسلامی بڑے اعتماد اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تحریک پاکستان ہی کے جذباتی پس منظر کو اجاگر کر کے اور "پاکستان کا مطلب کیا، لاالٰہ الااللہ" کے خالص مسلم لیگی نعرے کو اپنا کر، اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے نام پر وہ انقلابِ قیادت کی مہم تنہا اپنے زورِ بازو کے بل پر بہت جلد سر کر لے گی۔ چنانچہ اُس وقت اگر کسی اور نے اس کو تعاون و اشتراک کی پیشکش بھی کی تو اس نے نہایت حقارت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔

لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں اور تنہا اپنے زورِ بازو سے کام نہیں چل سکے گا تو جماعت نے مذہب ہی کے نام پر علماء اور مذہبی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک عرصے تک جماعت اسلامی کی مذہبی سیاست "علماء کے متحدہ و متفقہ مطالبات" کی بنیاد پر چلتی رہی۔

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد پھر محسوس ہوا کہ چڑھائی بہت سخت ہے اور گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ایک قدم اور نیچے اتر کر خالص "جمہوریت" کے نعرے پر سیاست کی نئی بساط بچھائی گئی جس پر تاحال سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے----!!----اور جس کا مظہرِ کمال یہ ہے کہ "ڈی اے سی" جس میں پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے دونوں مذہبی پہلوان اس وقت مجتمع ہیں، اس کے مطالبات اور متفقہ نکات میں غریب اسلام کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں!

خدا شاہد ہے کہ ہمارے پیش نظر کسی جماعت کی تنقیص ہرگز نہیں۔ ان گزارشات سے ہمارا مقصد صرف اپنی اس رائے کی وضاحت ہے کہ موجودہ سیاست کا دین و مذہب سے قطعاً کوئی

تعلق نہیں اور وقت کا جو دھارا خالص غیر مذہبی و لادینی رخ پر بہہ رہا ہے' اس کی مختلف لہروں کی باہمی آویزش میں اسلام کا نام استعمال کرنا اور خاص طور پر اسے موجودہ بوسیدہ' گلے سڑے اور ظالمانہ و استحصالی نظامِ معیشت کا پشت پناہ بنا کر کھڑا کر دینا اسلام کی دوستی نہیں' اس کے ساتھ دشمنی ہے۔ تاریخ کے رخ کا جو "ڈان" ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے اس کا رخ مذہب کی جانب موڑنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے فلسفہ و فکر کے میدان میں انقلاب برپا کیا جائے اور روحانی اقدار کا از سرِ نو احیا ہو' ایمان و یقین کی روشنی دنیا میں پھیلے' اور اخلاق و اعمال میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں۔ جب یہ انقلاب کسی انسانی معاشرے میں ایک معتدبہ حد تک رونما ہو چکے گا تب کہیں جا کر اس کا امکان پیدا ہو گا کہ اس کی سیاست بھی مذہب کے تابع ہو اور وہاں خدا پرستانہ نظامِ زندگی پوری شان کے ساتھ جلوہ آرا ہو سکے---- ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ ان اعتبارات سے دین و مذہب کی روح سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا جن کا اصل تعلق اسلام اور صرف اسلام سے ہو اور جن کی زندگیوں کا مقصود صرف اور صرف احیائے اسلام و اقامتِ دین ہو' موجودہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنی قوتوں' صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ یہ کہ ----- اگر علمی و فکری کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو تعلیم و تعلّمِ قرآن کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیں اور کتاب اللہ کے علم و حکمت کی تحصیل و اشاعت میں مصروف ہو جائیں۔ اس لئے کہ ایمان و یقین کے احیاء کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں----- اور اگر علمی کام سے مناسبت نہ رکھتے ہوں تو معاشرے کے کونوں کھدروں میں بیٹھ جائیں اور خلوص و اخلاص کی قوتوں کو بروئے کار لا کر عوام الناس میں دینی و روحانی اقدار کی از سرِ نو ترویج کی کوشش کریں۔

ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا' لیکن پاکستان کے معجز نما ظہور---- اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقاء کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور پورے عالمِ ارضی میں غلبۂ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے۔ اور اسی بنا پر ہمیں اس کا بقا و وجود بھی عزیز ہے اور اس میں انتشار اور انارکی کسی صورت گوارا نہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس مبارک انقلاب کی ابتداء سیاسی میدان سے نہیں بلکہ علم و فکر اور فلسفہ و حکمت کے میدان سے ہو گی۔ اور

ایک علمی و تعلیمی انقلاب کے سوا اس کی کوئی راہ موجود نہیں---اس میدان میں بالکل ابتدائی اور کمیت کے اعتبار سے نہایت حقیر کوشش کئے چلے جانا بھی' چاہے اس کے محسوس نتائج سامنے نہ آئیں' ہمارے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ سیاسی میدان میں بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شرکت کی جائے' لیکن بجائے اس کے رخ کو دین و مذہب کے جانب موڑنے کے خود اس کی رو میں بہہ جایا جائے!۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے!!

اللہ تعالیٰ ہمیں مسلمان جینے اور ایمان پر مرنے کی سعادت نصیب فرمائے!!--- آمین!

(۳)

مارچ ۱۹۶۹ء

آج سے دو ماہ قبل' جنوری ۱۹۶۹ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں "میثاق" کے دورِ جدید کے ڈھائی سال کے عرصے میں پہلی بار ملکی سیاسیات پر قلم اٹھایا گیا تھا۔ "میثاق" کے تیرہ صفحات پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں پاکستان کی موجودہ سیاست کے رجحانات اور ان کے پشت پر کار فرما عوامل کا جو تجزیہ ہم نے اپنے فہم کے مطابق کیا تھا وہ قارئینِ "میثاق" کے حلقے میں تو بالعموم پسند کیا ہی گیا' بعض دوسرے حلقوں کی جانب سے بھی اس کی تائید و تصویب ہوئی {۱}۔ اور عام طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ یہ صورتحال کی واقعی اور حقیقی عکاسی اور مسائل و معاملات کا صحیح و بے لاگ تجزیہ ہے---- اس تحریر کی اشاعت کے بعد کے دو ماہ بلاشبہ پاکستانی سیاسیات کی اکیس سالہ تاریخ کا اہم ترین دور ہیں' جن میں عوامی تحریک ایک طوفان بن کر اٹھی اور ایسی معرکتہ الآرا تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا کوئی تصور بھی چھ ماہ قبل تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس طوفان کے متعدد ریلے گزر جانے کے بعد جو صورتحال سامنے آئی ہے اور پاکستانی سیاست کی سٹیج پر جو تازہ نقشہ جما ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جس کی تصویر ہم نے دو ماہ قبل کی اس تحریر میں کھینچی تھی۔

{۱} چنانچہ ہفت روزہ "نصرت" نے جسے اس وقت مسٹر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کے سرکاری ترجمان کی حیثیت حاصل ہے اپنی اکیسویں اشاعت میں اس پوری تحریر کو نقل کیا۔

گزشتہ دو ماہ کے دوران کی ساری کھینچ تان اور اکھیڑ پچھاڑ اور اتنی مختلف النوع پیش قدمیوں اور پسپائیوں کے بعد جو صورتحال واضح ہو کر سامنے آتی ہے اس کا اس قدر صحیح اور پیشگی اندازہ صرف اسی لئے ممکن ہو سکا کہ ہمارا مطالعہ خالصتاً معروضی تھا اور اس میں ہماری پسند یا ناپسند کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ صورتِ واقعہ جیسی کچھ ہے ہم نے اسے بعینہٖ اسی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور بغیر کسی قطع و برید اور کتر بیونت کے جوں کا توں پیش کر دیا۔

ہماری گزشتہ ماہ کی پیش کردہ مندرجہ ذیل رائے بھی اگر ذہن میں تازہ کر لی جائے تو جو صورت حال اب درپیش ہے اس کی نقشہ کشی بھی مکمل ہو جائے گی اور اس کے بارے میں ہماری رائے بھی ایک بار پھر واضح ہو جائے گی :

"اس تازہ ایجی ٹیشن پر صدر ایوب کا ردعمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لئے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورتحال کو صرف "بعض شرپسند لوگوں" کی جانب منسوب کر کے تشدد کی راہ اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہرحال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے انہوں نے یقیناً دانشمندی کا ثبوت دیا ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہئے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی صاف محسوس ہو رہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کئے رکھا ہے اور جس نہج پر اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی عنصر کے لئے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں، انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے۔ معاملہ جو بھی ہو سکتا ہے، دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہو سکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں---- لہٰذا پہلا خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جدوجہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی--- پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جتھوں کا مجموعہ ہے۔ مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند در چند وجوہ کی بنا پر صدر

ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لئے بھی بہت مشکل ہو گئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ ع "آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک" کی سی کیفیت سے بغل گیر ہو جانا چاہئے۔

تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود پورا ہو گا---- اور انتشار، لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر، ہمارے نزدیک فی الوقت ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح تر بھی ہے"۔

وقت کا یہ "اہم تقاضا" ہونے کو پورا تو ہو گیا لیکن جو "موانع و مشکلات" اس کی راہ میں پیش آئی ہیں اور ان کے دوران پاکستان اپنی سیاسی تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گزرا ہے اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے۔

صدر ایوب کی گفت و شنید کی دعوت نے پوری ڈی اے سی کو بالکل اچانک آلیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تو وہ غریب شش و پنج میں مبتلا رہی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ صدر ایوب تو ایک فرد تھے، انہوں نے ایک رخ پر چلتے چلتے اچانک اباؤٹ ٹرن کر لیا، لیکن ایک تحریک کی رواں دواں گاڑی کو تو بریک لگاتے لگاتے بھی آخر وقت لگتا ہے۔ دوسری جانب یہ خطرہ بھی واقعی اور حقیقی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ایک قیادت عوامی تحریک کو بریک لگا کر نیچے اترے ادھر دوسری قیادت اس کے انجن کو دوبارہ سٹارٹ کر کے لے کر چلتی بنے۔ تیسری طرف یہ معاملہ بھی صاف تھا کہ اب یہ عوامی تحریک اگر مزید آگے بڑھی تو اس کا روکنا مشکل تر ہو جائے گا اور پھر اس کا تمام تر فائدہ بائیں بازو کے لوگوں کے حصے میں آئے گا۔

یہ اسباب و عوامل تھے جن کی بنا پر وہ عمل اندرونی طور پر بڑی تیزی کے ساتھ لیکن ظاہری اعتبار سے بڑی تدریج اور مدھم چال کے ساتھ شروع ہوا جسے اب مسٹر بھٹو بجا طور پر "غیر فوجی انقلاب" (Civilian Coup de tat) سے تعبیر کر رہے ہیں۔[۲]

{۲} عین اس مرحلے پر جبکہ پاکستان اس "غیر فوجی انقلاب" سے گزر رہا ہے، مسٹر آدم ملک وزیر خارجہ انڈونیشیا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مفاہمت اور مصالحت کا یہ عمل بنیادی طور پر تین لوگوں ہی کے مابین ہوا ہے اور اگر کوئی "عبوری قومی حکومت" وجود میں آئی جس کا امکان بالکل خارج از بحث نہیں تو وہ اصلاً ان لیگ ہائے ثلاثہ ہی پر مشتمل ہوگی۔

اس عمل کی مخالفت و مزاحمت بھی، جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا، بائیں بازو کے انتہا پسند لوگوں ہی کی جانب سے ہوئی۔ مسٹر بھٹو چونکہ ابھی کوئی مستحکم تنظیم نہیں رکھتے اور بدلتے ہوئے حالات نے گویا کم از کم وقتی طور پر تو ان کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی ہے لہٰذا انہیں محض منفعلانہ مخالفت (Passive Resistance) پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن مولانا بھاشانی چونکہ اپنی پشت پر ایک واقعی عوامی سیاسی قوت بھی رکھتے ہیں لہٰذا انہوں نے اس مفاہمت کو بر سرِ میدان للکارا اور بالفعل یہ کوشش کی کہ اب جبکہ ڈی اے سی عوامی تحریک کو بریک لگا رہی ہے وہ خود اس کی قیادت سنبھال کر اپنے پیش نظر انقلاب کی داغ بیل ڈال دیں۔

> ----اور واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں اس "انقلاب" کی ابتدا ہو گئی تھی۔ فروری ۶۹ء کی سترہ تاریخ سے اکیس تاریخ تک کے چند دن واقعتاً پاکستان کی تاریخ میں وہ تیسرا نازک موقع تھے جبکہ پاکستان کا وجود سخت خطرے سے دوچار تھا اور اس کی سالمیت سخت مشکوک ہو گئی تھی۔

ہم نے گزشتہ ماہ ان صفحات میں بر سبیلِ تذکرہ عرض کیا تھا کہ ---- "ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا لیکن پاکستان کے معجزنما ظہور ------ اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقاء کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور پورے عالمِ ارضی میں غلبۂ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے!" تحریک پاکستان کے اساسی محرکات اور پاکستان کے معجزنما قیام کے ضمن میں تو ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ مارچ تا مئی ۶۷ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ظاہر کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

جہاں کچھ عرصہ قبل ایک باقاعدہ فوجی انقلاب آیا تھا کا دورہ پاکستان اور حکومت پاکستان کی طرف سے سارتو حکومت کے ساتھ تعلقات مزید بڑھانے کی خواہش کا اظہار بہت معنی خیز ہے!!

چکے ہیں۔(یہ مضامین اب ہماری تالیف "اسلام اور پاکستان" میں شامل ہیں) رہے وہ دو اہم مواقع جن پر ہمارے نزدیک پاکستان کے وجود وبقا کا تحفظ بالکل معجزانہ طور پر ہوا تو ان میں سے پہلا موقع تو وہ تھا جب صدر ایوب نے اُس وقت جبکہ وہ پاکستان کے سیاہ و سفید کے بالکل تنہا مالک تھے امریکی اثرات کے تحت "متحدہ دفاع" (Joint Defence) کی تجویز کی صورت میں گویا پاکستان کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر بھارت کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت و مشیت کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ پنڈت نہرو کی عقل اس وقت ماری گئی اور انہوں نے کمال رعونت کے ساتھ صدر ایوب کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا {۳} اور اس طرح خالصتاً معجزانہ طور پر پاکستان کا مستقل وجود برقرار رہ گیا {۴}------ دوسرا موقع ۶۵ء کی جنگ تھی جس میں پاکستان کا بچ جانا کسی دنیوی حساب کتاب سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی کو پاکستان کا تحفظ و بقا مطلوب ہے!

ہمارے تجزیئے میں ہر اعتبار سے ان دونوں مواقع کے برابر نازک موقع سترہ تا اکیس فروری ۶۹ء کے چند دن تھے۔ اور ہمارے نزدیک اگر اس موقع پر صدر ایوب وہ بھاری قیمت ادا نہ کرتے جو انہوں نے اولاً انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر کے ادا کی جو ایک کھلے اعترافِ شکست کے مترادف تھا اور پھر اگرتلہ سازش کیس واپس لے کر ادا کی جو داخلی و بین الاقوامی دونوں حیثیتوں سے سخت ذلت آمیز صورت تھی، تو واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی

{۳} یادش بخیر، بالکل اسی مقام سے پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے "چین نواز" دور کا آغاز ایک بالکل ناگزیر ضرورت کے طور پر ہوا تھا۔ راقم نے بارہا نجی گفتگوؤں میں اس صورت حال کو اس تشبیہ سے تعبیر کیا ہے کہ امریکہ کے زیر اثر صدر ایوب نے پنڈت نہرو اور بھارت کے سامنے رکوع تو کر لیا لیکن پنڈت جی شاید اپنے تہذیبی پس منظر کی بنا پر چاہتے تھے کہ وہ باقاعدہ سجدہ کریں جسے ایک مسلمان کا بیٹا گوارا نہ کر سکا۔ چنانچہ بجائے سجدہ کرنے کے صدر ایوب الٹے تن کر کھڑے ہو گئے اور اس کے بعد مسلسل نہ صرف بھارت بلکہ اس کے معنوی سرپرست امریکہ سے بھی دور ہوتے چلے گئے۔ نتیجتاً پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کا جھکاؤ چین کی جانب ہوتا چلا گیا!

{۴} یاد رہے کہ آنجہانی پنڈت نہرو ہی کی ایک پہلی حماقت کے نتیجے میں پاکستان اپنی موجودہ صورت میں دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا تھا۔ ورنہ مسلم لیگ نے تو کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لیا تھا۔ اور اگر کبھی تین خطوں پر مشتمل "مہا بھارت" ایک بار وجود میں آ جاتا تو پھر کسے معلوم کہ پھر کبھی علیحدگی ممکن ہو سکتی یا نہیں!

کے جاری کردہ "انقلاب" کو روکنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی!------{۵}

اور اس صورت میں پاکستان کے مشرقی و مغربی خطوں کے حالات ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہو جاتے کہ پھر ان کے ساتھ رہنے کی کوئی صورت ممکن نہ رہتی اور عوامی جمہوریہ چین کی زیر سرپرستی مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال پر مشتمل ایک علیحدہ کمیونسٹ ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہو جاتی{۶}

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے پاکستان اور اہلِ پاکستان پر کہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اس موقع پر بالکل گھٹنے ٹیک دینے کی سخت ذلت آمیز کیفیت کو گوارا کر لیا اور اس طرح پاکستان کی سالمیت کو جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ کم از کم فوری طور پر ٹل گیا------!

ہم ایک سے زائد بار اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک نہ سیاسی جبر و استبداد کے خلاف عوام کی جدوجہد کوئی بری چیز ہے نہ ہی معاشی ظلم و استحصال کے خلاف عوامی تحریک چلانا کسی درجے میں کوئی غلط کام ہے۔ دونوں ہی مقاصد اپنی اپنی جگہ درست ہیں' بلکہ ہمیں ان لوگوں کی رائے میں بہت وزن معلوم ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لائے بغیر سیاسی ڈھانچوں میں سطحی اور اوپری تبدیلیوں سے قطعاً کچھ حاصل نہ ہو گا اور نام نہاد جمہوریت بھی اس صورت میں سرمایہ داروں کے گھر کی لونڈی بن کر رہ جائے گی---- لیکن ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ یہ سارے معاملات معروف سیاسی اسلوب و طریق سے طے ہونے چاہئیں اور اس میں نہ تو لاقانونیت اور انارکی کا رنگ پیدا ہونا چاہئے اور نہ ہی انقلابی طریقے اختیار کئے جانے چاہئیں۔

{۵} مولانا بھاشانی کی سیاسی قوت کا جو مظاہرہ اس موقع پر ہوا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن پیرول پر رہائی کی صورت میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہی نہیں بے تاب تھے۔ لیکن مولانا بھاشانی کی سیاست نے پورے ملک کو تعطل اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا کئے رکھا تا آنکہ صدر ایوب نے متذکرہ بالا بھاری قیمت ادا کر کے مولانا بھاشانی کو بے بس کر دیا!

{۶} مغربی بنگال کے درمیانی زمانے کے انتخابات کے جو نتائج حال ہی میں سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر یہ خطرہ خیالی و وہمی نہیں----بالکل حقیقی تھا---

جو لوگ سیاست کے میدان میں ملک و ملت کی مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہوں انہیں چاہئے کہ محنت و مشقت سے کام کرنے کی عادت ڈالیں۔ اور مستقل مزاجی اور عزم و استقلال کے ساتھ اپنے اپنے نظریات کی نشر و اشاعت کریں اور اپنے اپنے پروگرام عوام کے سامنے پیش کریں اور اس طرح اپنے حق میں رائے عامہ کو ہموار کریں ---- پھر اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کو مضبوط و محکم تنظیمی سلسلوں میں منسلک کریں۔ اور کھلی سیاسی جدوجہد کے ذریعے ملک کے اجتماعی نظام میں اپنی صوابدید کے مطابق تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں ---- محض ہلڑبازی اور ہنگامہ آرائی یا وقتی مسائل و معاملات کو نعروں کی صورت میں اچھال کر عارضی شور و غوغا برپا کر دینے سے نہ صرف یہ کہ حاصل کچھ نہ ہو گا بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ کہیں کوئی ناقابلِ تلافی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اسی طرح انقلابی طریقوں کے اختیار کرنے میں بھی شدید خطرات مضمر ہیں اور بھلائی سے زیادہ برائی کا اندیشہ ہے۔ گویا کہ ان دونوں کی حیثیت ہمارے نزدیک وہی ہے جو قرآن مجید کی رو سے شراب اور قمار کی، یعنی اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔

اس اعتبار سے ہمارے لئے انگریز قوم کی تاریخ میں ایک بڑا اہم سبق ہے۔ اس قوم نے اپنے ملک میں "رائے عامہ" کے بروئے کار آنے کے راستوں کو ہمیشہ کھلا رکھا۔ نتیجتاً دنیا میں جتنے انقلاب آئے ان کے بہترین ثمرات سے بھی یہ متمتع ہوتی رہی لیکن کبھی کوئی انقلابی تبدیلی بھی اس کے یہاں برپا نہیں ہوئی۔ بادشاہت اور جاگیرداری کے خلاف "انقلاب" فرانس کی سرزمین پر رونما ہوا اور اس کے لئے فرانسیسی قوم کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، لیکن اس کے بہترین ثمرات سے انگلستان متمتع ہوا۔ چنانچہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوریت کی اعلیٰ ترین صورت وہاں قائم ہے اور لطف یہ ہے کہ علامتی بادشاہت بھی تاحال وہاں موجود ہے اور جاگیرداری نظام کے آثار کو بھی ابھی تک انہوں نے بالکلیہ ختم نہیں کیا۔ اسی طرح کمیونسٹ انقلاب کے لئے خون کی ندیاں دوسرے ممالک میں بہیں لیکن فلاحی ریاست اور کفالتِ عامہ کی خوبصورت ترین صورت کو آزاد معیشت کے ساتھ خوبصورت ترین طریقے پر انگلستان نے منتہی کیا---- اور یہ سب کچھ نہایت عمدہ تدریج کے ساتھ بالکل کھلی اور عیاں سیاسی سرگرمی کے نتیجے کے طور پر ہوتا رہا۔

اسی قسم کا ایک تجربہ ہمارے ہمسایہ ملک میں ہو رہا ہے جہاں جملہ معاملات کو سیاست کے میدان میں طے کرنے کے دروازے کھلے ہیں۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی حتیٰ کہ چین کے حامی

کمیونسٹوں پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ چنانچہ سیاست کے میدان میں اتار چڑھاؤ اور مدوجزر تو آتے رہتے ہیں، لیکن تاحال کسی "انقلاب" سے بھارت کو دوچار ہونا نہیں پڑا۔

ہمارے یہاں بھی خیر اسی میں ہے کہ یہ بات بطورِ اصولِ موضوعہ تسلیم کرلی جائے کہ جملہ معاملات و مسائل کا حل معروف سیاسی و جمہوری طریقوں پر ہوگا اور سب کو یہ حق حاصل ہوگا کہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرکے اختیار و اقتدار حاصل کرنے اور مسندِ حکومت پر قبضہ جمانے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سیاسی میدان کی پابندیوں کو حتی الامکان ختم کردیا جائے اور جذبہ و فکر کے اثر و نفوذ کی تمام راہوں کو حتی الامکان سب کے لئے یکساں کھول دیا جائے، تاکہ کہیں کسی زیرزمین سرگرمی یا انقلابی طریق کار کی ضرورت کا احساس ہی پیدا نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہمارے نزدیک مسٹر بھٹو کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پر سے بھی پابندی اٹھالی جانی چاہئے---- یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جذبہ و فکر کی راہوں کو کبھی مسدود نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ان کے ایک جانب بند باندھیں گے تو وہ دوسری جانب بہہ نکلیں گے۔ ہمارے حالیہ تجربے سے تو یہ بات بالکل ہی ثابت ہوگئی ہے کہ کسی فکر کو پابند و پابجولاں کرنا ممکن نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی پر ہمارے یہاں پابندی عائد رہی، لیکن کمیونسٹ انقلاب ہمارے نصفِ بہتر خطے کے عین دروازوں تک پہنچ گیا تھا---! فکر کا مقابلہ جوابی فکر ہی سے کیا جاسکتا ہے اور معاملات و مسائل کا حل ان کا مردانہ وار مواجہہ (Face) کرنے ہی سے ممکن ہے۔ مصنوعی پابندیوں اور فراری ذہنیت سے کوئی معرکہ سر نہیں کیا جاسکتا!

ایک دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ ملکی سیاست کے میدان میں مذہب کا نام نہایت احتیاط کے ساتھ اور بالکل ناگزیر حد تک ہی لیا جانا چاہئے۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا بالعموم مذہبی اعتبار سے جو حال ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے اور خود عوام کی ایک عظیم اکثریت میں بنیادی اخلاقی و روحانی اقدار جس سطح پر ہیں وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ تو جب مذہب اس وقت نہ ہمارے فکر میں سرایت کئے ہوئے ہے نہ جذبے میں تو آخر سیاست کے میدان میں اس کی کارفرمائی کیسے ہوگی؟ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ دین و مذہب کے اعتبار سے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں اور شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مابین کون سا فرق و تفاوت ہے؟---- بلکہ عجیب تر صورت یہ ہے کہ پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے داعیٔ اعظم مولانا بھاشانی تو علمائے

دیوبند کے صحبت یافتہ اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اور نظام اسلام پارٹی کے متعدد اہم کارکنوں کے ملی و قومی جذبہ و اخلاص کے معترف ہونے کے باوجود ذاتی طور پر ہمیں معلوم ہے کہ وہ جمعے کی نماز پڑھنے کے بھی روادار نہیں!..... مقصود کسی کی تنقیص نہیں بلکہ صرف اس امر کی وضاحت ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب بالکل بنیاد سے تعمیرِ جدید کا محتاج ہے اور احیاءِ اسلام کی آرزو رکھنے والے لوگوں کو پہلے فکر کے میدان میں اسلامی انقلاب اور عوامی سطح پر اسلام کی مخصوص اخلاقی و روحانی اقدار کی از سرِ نو ترویج کا کٹھن اور صبر آزما کام کرنا ہوگا۔ موجود الوقت حالات میں سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ لگانا اور سیاسی و معاشی مسائل میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے حامل لوگوں پر کفر و الحاد کے فتوے چسپاں کرنا بالآخر خود دین و مذہب کے لئے مضر ثابت ہوگا۔

سوچنا چاہئے کہ اس وقت جو مسائل بالعموم ملک اور قوم کے سامنے ہیں ان میں سے آخر کون سے مسئلے کا کوئی خاص تعلق دین و مذہب سے ہے؟ طرزِ حکومت وحدانی ہو یا وفاقی، جمہوریت صدارتی ہو یا پارلیمانی، انتخابات بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ، مغربی پاکستان ایک صوبہ رہے یا دوبارہ متعدد صوبوں میں منقسم ہو جائے۔ جس طرح ان تمام مسائل میں اسلام کا کوئی ایک منصوص حکم نہیں ہے بلکہ حالات و ضروریات کے اعتبار سے مناسب تر کوئی صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے اسی طرح ان مسائل میں بھی اسلام میں حالات و ضروریات کے مطابق مناسب صورتیں اختیار کرنے کی بڑی گنجائش ہے کہ زمین کا بندوبست کن بنیادوں پر ہو اور بڑی بڑی صنعتوں اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت برقرار رکھی جائے یا انہیں اجتماعی ملکیت قرار دے کر حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مزارعت کا مسئلہ ہمارے یہاں سلف سے متنازعہ فیہ چلا آ رہا ہے اور حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرنے کی بجائے پوری ملّتِ اسلامی کی اجتماعی ملکیت قرار دے کر ایک اہم اجتہاد فرمایا تھا جس پر پوری امت کا اجماع بھی ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان مسائل میں دلیل کی بنیاد پر کوئی ایک یا دوسرا موقف تو اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اپنی کسی رائے کو اسلام کا حتمی فیصلہ قرار دے کر بقیہ آراء کو کفر و الحاد قرار دے دینا یقیناً زیادتی اور حدود سے تجاوز ہے۔ ہماری رائے میں بالکل صحیح کہا ہے مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مسائل و معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور ان کے حل کی مخلصانہ کوشش کی جائے، نہ یہ کہ جو بھی ذرا عام روش سے ہٹ کر بات کرے اس کے خلاف کفر

والحاد کے فتووں کی توپیں داغنی شروع کردی جائیں----!!

پاکستان میں بحالی جمہوریت کے علمبردار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اب پھر بس قبل از مارشل لاء کی سی جمہوریت ملک میں دوبارہ قائم ہو سکتی ہے اور بالکل اسی طرح کے سے حالات لوٹ کر آسکتے ہیں تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اس ملک میں اب حقیقی عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور جمہور اب صرف اس بات پر کبھی قانع نہ ہوں گے کہ ان کو "ووٹ" کی صورت میں سرمایہ داروں سے کچھ "نوٹ" حاصل کرنے کا ایک کاغذی ساحق مل جائے بلکہ وہ اپنے تمام سیاسی و معاشی حقوق کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس صورت حال میں اگر کسی نے مذہب کو ان کے خلاف دلیل کی حیثیت سے استعمال کیا تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ کہ مذہب کے ساتھ عوام کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہو جائے گا اور مذہب سے بیزاری کی عام رو چل نکلے گی۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالی موجود ہیں اور ہوش مند لوگوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی پہلی نشست اگرچہ کُل نصف گھنٹے کی تھی اور اس کی نوعیت خالص رسمی ملاقات کی تھی تاہم اس سے آئندہ صورتحال کا پورا نقشہ سامنے آگیا ہے اور اگرچہ فی الحال شرکائے کانفرنس بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں' چنانچہ کسی جانب سے "عبوری قومی حکومت" کا نام لیا جارہا ہے اور کوئی صرف نئے انتخابات تک کے لئے "عارضی نگران ادارے" کا نام لے رہا ہے' کوئی ۵۶ء کے دستور کی کامل بحالی کا مطالبہ کر رہا ہے تو کوئی بالکل نئے سرے سے دستور سازی کا تقاضا کر رہا ہے۔ ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ تو پرانا ہی تھا' اب شیخ مجیب الرحمٰن صاحب مشرقی و مغربی خطوں کے مابین مساوات (Parity) کے اصول کو بھی ختم کرنے پر تل گئے ہیں۔ غرضیکہ وہ تمام مسائل از سرنو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کی بنا پر پاکستان میں دستور سازی کے کام میں ابتداءً تاخیر و تعویق ہوئی تھی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ پاکستان کی ان تمام دستوری پیچیدگیوں کے حل کی عملی صورت کیا ہوگی--- تاہم یہ بات واضح ہے کہ کنونشن' کونسل اور عوامی تینوں لیگوں ہی کے مابین کچھ لے اور دے کر اور کسر و انکسار کے اصول کے تحت کوئی معاہدہ ہو جائے

گا اور ان ہی کے اتحاد و اتفاق سے کوئی مضبوط حکومت مرکز میں بن سکے گی---- دوسری جانب یہ بھی بالکل واضح ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو سے اتحاد کے اصل اپوزیشن وجود میں آئے گی۔ اور مقابل کے اصل دھڑے یہی دو ہوں گے۔ باقی رہے ڈی اے سی کے دوسرے شرکاء تو ان میں سے بعض اِدھر اور بعض اُدھر ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان کا ولی و قصوری گروپ اور مشرقی پاکستان کے شش نکاتی عوامی لیگ کے انتہا پسند طبقات اپوزیشن کے جانب آئیں گے اور مذہبی جماعتوں میں سے جمعیت علمائے اسلام بلاواسطہ یا بالواسطہ ان ہی کے پلڑے میں وزن ڈالے گی ---- دوسری طرف نظام اسلام اور جماعت اسلامی چاہے فوراً حکومت میں شرکت کو ترجیح دیں یا فی الحال باہر رہنے کو پسند کریں، بہرحال متذکرہ بالا اتحادِ ثلاثہ کو سہارا دیں گی---!!

آئندہ کی سیاست کا عملی نقشہ یہ بنے یا کوئی اور، ہماری دلی خواہش جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، صرف یہ ہے کہ سارے معاملات سیاست کے کھلے میدان میں معروف طریقے پر طے ہوں اور نہ تشدد، انارکی اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو، نہ انقلابی طور طریقے اختیار کئے جائیں۔

خدا کرے کہ اب ملک کے دونوں خطوں میں حالات معمول پر آجائیں، تعلیمی ادارے کھل جائیں اور زندگی کا عام کاروبار معمول کے مطابق جاری رہے اور طوفانی سیاست کی کوئی نئی لہر ملک کو اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ اس لئے کہ اب اگر کوئی نئی لہر اٹھی تو اس کا رنگ بالکل مختلف ہو گا۔ صدر ایوب اور ان کی حکومت تو اب میدان سے عملاً ہٹ ہی گئے ہیں۔ اب اگر تصادم ہوا تو عوام کا عوام سے ہو گا اور اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو دونوں اپنی موجودہ شکست کو کھلے دل سے قبول کر کے معروف طریقے پر اپوزیشن کا کردار اختیار کر لیں اور اپنی قوت کے مظاہرے اور کسی انقلابی اقدام کا خیال دل میں نہ آنے دیں---- بصورتِ دیگر پاکستان کے مشرقی و مغربی دونوں خطوں میں عوامی تصادم شدید ترین صورت میں ظاہر ہو گا۔ مشرق میں اصل مقابلہ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن کے مابین ہو گا اور مغرب میں مسٹر بھٹو اور جماعت اسلامی کے حامی طلبہ میں۔ مغرب میں تو دھمکیوں اور جوابی دھمکیوں کا آغاز بھی ہو چکا ہے،

مشرق میں فی الحال خاموشی ہے لیکن یہ خاموشی کسی بہت بڑے ٹکراؤ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ ہی اس نازک موقع پر پاکستان کی حفاظت فرمانے والا ہے!!

(۲)

آزادیٔ ہند کے بعد ابتداءً عام خیال یہ تھا کہ بھارت میں کمیونسٹ انقلاب کے امکانات بہت روشن ہیں، جبکہ پاکستان میں اس کا دُور دُور تک کوئی امکان نہیں! لیکن گزشتہ چھ ماہ کے دوران رفتہ رفتہ یہ بات واضح ہوتی چلی گئی ہے کہ دراصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اور آج کا پاکستان بھارت کے مقابلے میں کمیونزم اور سوشلزم سے زیادہ قریب ہے۔ سوچنا چاہئے کہ اس انقلاب کے اسباب کیا ہیں۔

متذکرہ بالا عام خیال کی بنیاد اس مغالطے پر تھی کہ پاکستان میں مذہب ایک مؤثر قوت ہے اور وہ کمیونزم کے سیلاب کی راہ میں ایک مضبوط بند ثابت ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ تھا اور حقیقت اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ قومی حیثیت سے ہمارے اوپر بھی مذہب کا رنگ ایک ملمع سے زیادہ نہیں۔ یہی لئے کہ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا مذہب نہ ہمارے فکر پر حاوی ہے اور نہ ہی اسے ہمارے اصل مؤثر طبقات کے جذبات میں کوئی حقیقی نفوذ حاصل ہے۔ خالص عوامی سطح پر جو جذباتی لگاؤ مذہب کے ساتھ ہے اس کی اجتماعیات میں کوئی فیصلہ کن اہمیت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کمیونزم کی متوقع روک تھام کرنے والا یہ دفاعی بند محض ہوائی و خیالی تھا اور اس کا بے حقیقت ہونا اب ثابت ہو چکا۔

اس اعتبار سے تو پاکستان اور بھارت ایک ہی جیسے تھے لیکن دو باتوں میں ان کے مابین بہت فرق و تفاوت تھا۔

ایک یہ کہ یہاں فکر اور نظریے کے میدان میں ایک گھپلا اور الجھاؤ مسلسل جاری رہا اور قوم کے اصل مؤثر طبقات کی لادینیت کے ساتھ ایک سطحی اور عوامی مذہبیت مسلسل الجھتی رہی جبکہ بھارت خالص لادینیت کی راہ پر گامزن رہا اور اس میدان میں کوئی منافقت کی راہ اس نے اختیار نہ کی۔

اور دوسرے یہ کہ ہمارے یہاں ایک مہیب سیاسی خلا تھا۔ چنانچہ نہ کوئی مضبوط سیاسی

جماعت موجود تھی نہ قابلِ اعتماد قومی قیادت---جبکہ بھارت میں ایک عظیم اور محکم سیاسی جماعت بھی موجود تھی اور ایک مضبوط اور معتمد علیہ قومی قیادت بھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہماری یہ "عریاں حقیقت نگاری" بہت سے لوگوں پر بڑی گراں گزرے گی، لیکن ہم مجبور ہیں کہ صورتِ واقعہ جیسی کچھ ہمیں نظر آتی ہے ویسی ہی بیان کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے نظریاتی گھپلے اور سیاسی خلا ہی نے موجودہ صورتحال کو جنم دیا ہے اور حالات کے رخ میں کوئی تبدیلی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ایک طرف نظریئے اور فکر کے میدان میں دوغلے پن کو ختم کر کے یکسوئی و یک رنگی اختیار کی جائے اور دوسری طرف سیاسی میدان کے خلا کو مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں اور کھلی اور بے روک ٹوک سیاسی سرگرمی کے ذریعے پُر کیا جائے۔

دوسری بات کے ضمن میں تو ہم تفصیل کے ساتھ اوپر لکھ چکے ہیں اب چند گزارشات پہلی بات کے ذیل میں عرض کرنی ہیں۔ خصوصاً اس امر کے پیشِ نظر کہ بعض حضرات نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ "ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی" اسلام آباد کو ختم کر دیا جائے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان میں نظریئے اور فکر کے میدان میں جو الجھاؤ موجود ہے اس کو جانبِ لادینیت نہیں بلکہ جانبِ دین و مذہب ہی سلجھانا ممکن ہے۔ اگر یہ بات مسلّم ہے کہ کسی ملک اور قوم کی اصل قوت اس کے عوام ہی ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ پاکستان کے عوام کا جذباتی تعلق بہرحال دین و مذہب ہی کے ساتھ ہے، لادینیت و لامذہبیت کے ساتھ نہیں۔ نتیجتاً قوم میں فکر و نظر کی یکسانی و یک رنگی پیدا کرنے کی صرف ایک صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ قوم کے طبقہ خواص کے اذہان بھی دین و مذہب کے رخ پر ڈھلیں اور ان کے قلوب بھی اسلام و ایمان کے نور سے منور ہوں۔ لیکن یہ کام جس قدر اہم اور ضروری ہے اسی قدر مشکل اور کٹھن بھی ہے اور محض سیاسی میدان میں عوام کی مذہبیت کے سہارے دین و مذہب کے نعرے لگانے سے یہ کام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے ایک عظیم علمی و تعلیمی تحریک کی جس کے ذریعے ایک طرف علم کو مومن بنایا جائے اور دوسری جانب آئندہ نسلوں کو مسلمان بنا کر اٹھایا جائے---اور چونکہ یہی وہ چیز ہے جس پر ہمارے نزدیک اسلام کے مستقبل اور احیائے اسلام اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا دارومدار بھی ہے اور پاکستان کے بقاو تحفظ کا انحصار بھی، لہٰذا ہم ان صفحات میں بھی اسی کی اہمیت بار بار اجاگر کرتے رہے ہیں۔ اور اپنی حقیر قوتوں اور صلاحیتوں اور محدود فرصت و مہلتِ عمر کا مصرف بھی ہم

نے یہی قرار دیا ہے کہ خالص قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک علمی و فکری تحریک کا اجراء ہو اور اس کے لئے ابتدائی اقدام کے طور پر ایک قرآن اکیڈمی قائم کی جائے۔ (الحمدللہ کہ "قرآن اکیڈمی" کا سنگِ بنیاد ۷۶ء میں رکھ دیا گیا تھا اور اب تو اس کے کوکھ سے "قرآن کالج" اور "قرآن آڈیٹوریم" بھی برآمد ہو چکے ہیں!)

علم و فکر کے میدان میں انقلابی کام کی توقع حکومتوں سے بالعموم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ حکومتیں عموماً موجود الوقت فکری و نظریاتی ماحول کی عکاسی ہی کر سکتی ہیں۔ رائج الوقت فکری دھاروں کو بدلنا عام طور پر افراد اور پرائیویٹ اداروں ہی کے کرنے کا کام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے گزشتہ اکیس سالوں کے دوران جدید و قدیم کے امتزاج کی ضرورت کے احساس کے تحت جتنے ادارے حکومت کی زیر سرپرستی قائم ہوئے وہ دین سے زیادہ بے دینی کے رخ پر بہہ نکلے اور ان سے اکثر و بیشتر فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا جس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال "ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی" کراچوی ثم اسلام آبادی ہے۔

اس ادارے کی داستان بہت طویل ہے۔ یہ اولاً کراچی میں مرحوم لیاقت علی خان کے دورِ حکومت میں مرحوم ظہیرالدین لال میاں کے پرزور اصرار پر قائم ہوا تھا۔ یکے بعد دیگرے متعدد حضرات اس کی سربراہی کے منصب پر فائز ہوئے لیکن اس کے کام کا کوئی واضح نقشہ متعین نہ ہو سکا۔ ۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد اس کی سربراہی ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے ہاتھ آئی اور ۶۲ء کے دستور میں اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل الفاظ میں متعین ہوئے :

"THE FUNCTION OF THE INSTITUTE SHALL BE TO UNDERTAKE ISLAMIC RESEARCH AND INSTRUCTION IN ISLAM FOR THE PURPOSE OF ASSISTING IN THE RECONSTRUCTION OF MUSLIM SOCIETY ON A TRULY ISLAMIC BASIS."

Constitution:ArticleNo.207(2)

لیکن افسوس کہ اس ادارے نے بجائے اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے بالکل دُور از کار اور لایعنی بحثوں کے دروازے کھول دیئے جن سے الجھنوں ہی میں اضافہ ہوا اور فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ نتیجتاً عوام میں اس ادارے کے خلاف غم اور غصہ کے

جذبات پیدا ہوئے جس کی انتہائی صورت پچھلے دنوں اس مطالبے کی شکل میں سامنے آئی کہ اس ادارے ہی کو بند کر دیا جائے۔

ہمارے نزدیک یہ مطالبہ محض غصے اور جھنجلاہٹ کا مظہر ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ چونکہ پاکستان اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے حاصل کیا گیا تھا لیکن گزشتہ اکیس سال کے عرصے میں یہاں نہ صرف یہ کہ اسلام کی جانب کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی بلکہ الٹی لادینیت اور اباحت پسندی ہی کو ترقی ہوئی لہٰذا پاکستان کا وجود عبث ہے اور اسے ختم کر دینا چاہئے۔

ہمارے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس ادارے کو جس پر پاکستان کے غریب عوام کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور لاکھوں روپیہ ہر سال خرچ ہو رہا ہے صحیح اور اہل لوگوں کے سپرد کیا جائے اور اس سے بالفعل وہی مقصد حاصل کیا جائے جس کے لئے اسے قائم کیا گیا تھا۔

پاکستان میں آئندہ جو حکومت بھی بنے' اور جو لوگ بھی برسر اقتدار آئیں ان سے ہماری مخلصانہ گزارش یہی ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ پاکستان کی ترقی و استحکام ہی نہیں اس کا عین وجود بھی اسی ایک امر پر منحصر ہے کہ آیا اسلام یہاں خواص و عوام دونوں کے اذہان و قلوب میں رچ بس کر پوری قوم میں فکر و نظر کی ہم آہنگی و یک رنگی پیدا کرتا ہے یا نہیں۔ اگر ہم نے جلد اس سوال کا مثبت جواب عملاً پیش نہ کیا تو جو صورت حال سامنے ہے اس کے پیش نظر دنیا کی اس عظیم ترین مسلمان مملکت کا چھوٹی چھوٹی علاقائی و لسانی قومیتوں میں بٹ کر منتشر ہونا اور پھر انہی بنیادوں پر آس پاس کی بڑی قومیتوں میں ضم ہو جانا یقینی ہے---اور یہ کام محض تقریروں اور بیانوں میں اسلام کی تعریف و توصیف سے نہیں ہو گا بلکہ صرف اس طرح ہو گا کہ ایک طرف علوم کو مسلمان بنایا جائے اور ایمان باللہ ہی کی بنیاد پر تمام طبعی' عمرانی اور نفسیاتی علوم کی تدوین جدید ہو اور دوسری طرف نظامِ تعلیم کے پورے ڈھانچے کو از سرِ نو اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے---ان دونوں کاموں میں بھی مقدم چونکہ بہرحال علوم کی تدوینِ جدید ہی ہے اور اس ضمن میں اسلامی ریسرچ کے سرکاری و نیم سرکاری ادارے نہایت وقیع خدمت سرانجام دے سکتے ہیں' لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ یہ ادارے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیئے جائیں جو جدید و قدیم دونوں علوم پر حاوی بھی ہوں اور ذہناً مسلم اور قلباً مومن بھی ہوں اور اسلامی ریسرچ کے کام کو صحیح خطوط

پر آگے بڑھا سکیں۔ خدا کرے کہ یہ اہم ترین کام جو ہمارے یہاں اب تک نظرانداز ہوتا آیا ہے' اب مزید مؤخر نہ ہو!

اس سلسلے میں اپنی جانب سے ایک حقیری کوشش کے طور پر ہم ہی نے "تحقیق اسلامی: اس کے معنی و مدعا و دائرہ کار" کے موضوع پر محترم ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا مقالہ بالاقساط "میثاق" میں شائع کیا اور ان شاءاللہ بہت جلد اسے ایک پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کر دیں گے۔ (یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور مکتبہ انجمن سے حاصل کی جاسکتی ہے) ہمارے نزدیک یہ مقالہ اپنے موضوع پر قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ قوم کا ہر صاحبِ بصیرت شخص جو ذہناً و قلباً مؤمن و مسلم ہو' اس کے مندرجات کو اپنے دل کی آواز محسوس کرے گا!

تعلیم و تعلّم کے میدان میں

علم و آگہی کا علمبردار

ماہنامہ افکارِ معلّم لاہور

ہر شمارہ معلومات کا خزینہ

فکر انگیز مضامین سے مزین

احیائے اسلام کا نقیب

قیمت عام شمارہ:- 12/ روپے سالانہ چندہ:- 120/ روپے

نمونہ کا پرچہ طلب فرمائیں

"تنظیم منزل" ۳۔ بہاول شیر روڈ' مزنگ' لاہور۔ ۵۴۰۰۰

جنرل محمد یحییٰ خاں کا مارشل لاء

مئی ۱۹۶۹ء

ملک میں مارشل لاء کو نافذ ہوئے سوا مہینہ ہو گیا ہے اور اس عرصے میں وہ گومگو کی سی کیفیت اور غیر یقینی سی صورتحال ختم ہو چکی ہے جو کسی اچانک تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ تک فطری طور پر طاری رہتی ہے۔ اس دوران میں نہ صرف یہ کہ حالیہ فوجی حکومت کے ذمہ دار حضرات نے قوم کو بار بار یہ اطمینان دلایا ہے بلکہ اب تو ان کے طرز عمل سے بھی بہت حد تک ثابت ہو گیا ہے کہ نہ وہ کوئی سیاسی عزائم رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے دورِ اقتدار کو غیر ضروری طول دینے کے خواہش مند ہیں بلکہ ان کا مقصد محض ایک ایسی صورتحال کو جو بالکل بے قابو ہوئی جا رہی تھی قابو میں لانا اور ملک کی سیاسی زندگی کی گاڑی کو از سرِ نو صحیح پٹڑی پر ڈالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ امر انتہائی اطمینان بخش ہے اور موجودہ فوجی قیادت اس پر پوری قوم کے تشکر و امتنان کی مستحق ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حالیہ مارشل لاء گزشتہ مارشل لاء سے بہت مختلف ہے جو بڑی آن بان کے ساتھ ملک و ملت کے جملہ عوارض و امراض کی مسیحائی کے دعوے کے ساتھ آیا تھا اور جس نے صرف ایک نیا تنظیمی ڈھانچہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل جدید سیاسی فلسفہ اور مختلف عمرانی معاملات حتیٰ کہ دینی و مذہبی مسائل میں بھی ایک نیا اندازِ فکر قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی ---- حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے معاملات مارشل لاء کے فطری دائرۂ کار سے باہر ہیں مارشل لاء کبھی کسی قوم یا ملک کے امراض و عوارض کا مستقل اور پائیدار علاج نہیں بن سکتا۔ اس کی مثال زیادہ سے زیادہ ان فوری اور سریع الاثر مگر خالص وقتی اور عارضی افاقہ بخش ادویہ کی سی ہے جو کسی مرض کی بحرانی کیفیت میں فوری خطرے کو ٹالنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

ہم ان صفحات میں اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ دیانت دار اور باضمیر سیاسی کارکنوں، منظم و محکم سیاسی جماعتوں اور مسلسل اور پیہم سیاسی سرگرمی کا فقدان ہماری قومی و ملی زندگی کا ایک مہیب اور خطرناک خلا ہے جسے لازماً پر کیا جانا چاہئے ---- ا

ظاہر ہے کہ یہ خلا اگر پُر ہو سکتا ہے تو سیاسی سرگرمی ہی سے ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی اور مارشل لاء ہرگز اس خلاء کو پر نہیں کر سکتا---مارشل لاء زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ ملک کی انتظامی مشینری کو پوری رفتار سے حرکت میں لے آئے، سستی اور کاہلی کا قلع قمع کر دے، سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں جمع شدہ کام تیزی سے پورا کرا دے، دھاندلی اور غنڈہ گری کا سدِباب کر دے، شہری زندگی کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کرا دے اور سرکاری واجبات کی وصولی کا فوری بندوبست کر دے۔ اور الحمدللہ کہ یہ سارے کام پورے زور شور کے ساتھ اِس وقت جاری ہیں ----رہا ملک اور قوم میں فکری و نظریاتی ہم آہنگی پیدا کرنا اور ملک و ملت کو ایک جذبۂ تازہ دے کر سرگرمِ عمل کرنا تو ظاہر ہے کہ نہ کسی فوجی حکومت سے اس کی توقع کی جاتی ہے اور نہ ہی، خدا کا شکر ہے کہ ان معاملات میں موجودہ فوجی قیادت نے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کسی لمبی چوڑی مہم کا آغاز ہی کیا ہے----خدا کرے کہ یہ صورتحال برقرار رہے----اور صدر مملکت آغا محمد یحییٰ خان اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے کی بجائے جلد از جلد ان سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ایک طرف تو ہر چڑھتے سورج کی پرستش کو اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ہر اس شخص کو جو کسی وقت کسی طرح برسراقتدار آجائے قوت و اقتدار کے نشے میں مست کر کے اس کے ذریعے اپنا اُلّو سیدھا کرنے میں بھی یدِطولیٰ رکھتے ہیں----ایسے لوگ سروسز میں بھی کثرت سے ہیں اور پرانے زمینداروں اور نئے صنعت کاروں میں بھی۔ اور حال ہی میں ان کی صفوں میں کچھ سرگرمی کے آثار بھی نظر آئے ہیں---- خدا کرے کہ موجودہ فوجی قیادت ایسے لوگوں کے منحوس اثرات سے محفوظ رہے اور کم سے کم مدت میں ان نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر جو اس وقت اس کے کاندھوں پر آگئی ہیں اپنی تمام تر توجہات اور مساعی کو اپنی اصل اور مستقل ذمہ داری یعنی دفاعِ وطن عزیز پر مرکوز کر سکے۔

مارشل لاء کے نفاذ سے قبل مسلسل پانچ چھ ماہ سے جو ہنگامی صورتحال پورے ملک پر طاری چلی آرہی تھی اس کے یک لخت خاتمے سے جو پرسکون کیفیت پیدا ہوئی اس میں ملک و ملت کے بہی

خواہوں میں سے بہت سے اصحابِ فکر و نظر نے ان عوامل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے جن کے نتیجے میں ہمارے یہاں سیاسی عدم استحکام اور فکری و نظریاتی انتشار پیدا ہوا ہے اور یہ مسلسل بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اخبارات و رسائل میں بہت سے عمدہ مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے ہیں جن سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے اصحابِ فکر و نظر اس امر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ قوم میں فکر و نظر کی وہی یک جہتی اور جذبہ و عمل کی وہی ہم آہنگی دوبارہ پیدا کی جائے جو آج سے تقریباً ربع صدی قبل کچھ عرصے کے لئے ملّتِ اسلامیہ پاک و ہند میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے نتیجے کے طور پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اُس وقت وہ کیفیت کیوں اور کن اسباب و عوامل سے پیدا ہوئی تھی اور آج اسے کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے، مبہم طور پر یہ کہہ دینا کہ اُس وقت بھی وہ جذبہ اسلام کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا---اور آج بھی اسے اسلام ہی کی بنیاد پر دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شاعری میں تو شاید روا ہو لیکن ملک و ملت کے ٹھوس مسائل سے بحث کرنے والی سنجیدہ علمی تحریروں کے شایانِ شان نہیں----اس لئے کہ اس کے معاً بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ سب کچھ اسلام ہی کی بنیاد پر تھا تو بعد میں وہ ختم کیوں ہو گیا؟ جبکہ اسلام سے نہ اس قوم کے عوام منحرف ہوئے نہ خواص---- بلکہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو یہاں کبھی کسی حیثیت سے برسرِاقتدار رہا ہو اور اٹھتے بیٹھتے اسلام کا کلمہ نہ پڑھتا رہا ہو اور اپنے جملہ مسائل و مشکلات کا حل اسلام ہی میں نہ بتاتا رہا ہو۔

ہمارے یہاں "اسلام!"---- "اسلام!" اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے اس وقت جس زور شور کے ساتھ لگ رہے ہیں، ویسے تو ہمارے لئے وہ ہر حال میں خوش آئند ہیں اور ہم بہرصورت انہیں خوش آمدید کہتے ہیں، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج سے رُبع صدی قبل کسی محکم اور پائیدار اساس کے بغیر محض ہوا میں ان نعروں کی گونج پیدا کر کے مسلسل بائیس سال تک ہم جس طرح ان کی مٹی پلید کرتے آئے ہیں، ہمیں خدشہ ہے کہ آج جس انداز سے یہ نعرے لگ رہے ہیں اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل میں ان کی حرمت کو کچھ اور بھی زیادہ ہی بٹا لگایا جائے گا اور ان مقدس الفاظ کی رسوائی پہلے سے بھی کچھ زائد ہی ہو گی۔ اس کا تھوڑا سا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس وقت جو جلوس یہ نعرے لگاتے تھے ان میں شامل

واتین کی اکثریت باپردہ اور برقع پوش ہوتی تھیں ---- اور آج وہ نوجوان لڑکیاں ان کی علمبردار ہیں
و پردے اور برقعے کی قید سے بالکل آزاد ہو چکی ہیں اور نیم عریاں ٹیڈی لباس میں ملبوس ہیں ----
ع "قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا!"

ہمارے یہاں اِس وقت جن اصحابِ قلم و قرطاس نے "اسلام" کی دہائی دی ہے ان میں سے
کچھ تو وہ ہیں جو "سوشلزم" کے ہوّے سے خوفزدہ ہو کر اسلام کی پناہ گاہ کی جانب رجوع کرنے پر
بور ہوئے ہیں اور جن کے دین و مذہب سے تازہ شغف کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ
ع "جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا!"

ان کو ایک طرف رکھتے ہوئے بعض ایسے حضرات کا حال بھی' جن کے خلوص اور اخلاص
کے ہم بھی معترف ہیں اور جن کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ اسلام کے قدیم شیدائی و فدائی
ں' یہ ہے کہ خود ان کا مسجد سے کوئی رشتہ و تعلق نہیں اور ان کی جوان لڑکیاں بے پردہ گھومتی اور
قائدِ عالم" کا لقب پاتی ہیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون!

خدا کے لئے حقائق کا مواجہہ کرنا سیکھئے! ---- حقائق سے گریز محض خود فریبی ہے' اس سے نہ
ارض و سماء دھوکا کھاتے ہیں' نہ خالقِ ارض و سماوات' اور "وَمَا يَخْدَعُونَ اِلَّا
اَنْفُسَهُمْ!" کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ---- واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے تو پوری امتِ
مسلمہ بحیثیتِ مجموعی کب کی دستبردار ہو چکی۔ دین و مذہب کے ساتھ اس کا مخلصانہ رشتہ استوار
تا تو یہ عالمگیر ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں ہوتی۔ غلطی "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ
مُؤْمِنِيْنَ" میں نہیں' امت کے دعویٰ ایمان میں ہے۔

میر کے دین و مذہب کی کیا پوچھو ہو جی ' ان نے تو
قشقہ کھینچا' دَیر میں بیٹھا' کب کا ترک اسلام کیا

مدتِ مدید گزری کہ اسلام کا شجرۂ طیبہ بیخ و بن سے اکھڑ چکا اور اب از سرِ نو تخم ریزی و آبیاری کا
اج ہے۔ دین و مذہب کی عمارت محض شکستہ ہی نہیں ہوئی کہ ادھر ادھر کی مرمت سے کام چل
ئے' یہ عظیم تعمیر کبھی کی زمین بوس ہو چکی۔ اور اگرچہ اس کے کھنڈر اب بھی اس کی عظمتِ رفتہ
، شاہد ہیں' تاہم اب ضرورت بالکل بنیاد سے از سرِ نو تعمیر کی ہے اور افسوس کہ امتِ مسلمہ تاحال
ں حقیقت کے اعتراف تک پر آمادہ نہیں' بلکہ مسلسل مغالطے ہی میں مبتلا رہنے پر مصر ہے ---- !تو

پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر ہر تدبیر الٹی پڑتی نظر آئے اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ آج سے ربع صدی قبل ملتِ اسلامیہ ہندوپاک کی باسی کڑھی میں جو ابال آیا تھا اس کا اصل محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا' نہ آج اس کی ملی و اجتماعی زندگی میں دین و مذہب کو کسی مؤثر عامل کی حیثیت حاصل ہے! اُس وقت کا سارا جوش و خروش ایک ایسی قوم کے جذبۂ تحفظ و خود اختیاری کا رہینِ منت تھا' جس کی بنیاد تو صدیوں پہلے مذہب ہی کی اساس پر قائم ہوئی تھی لیکن جس کا دین و مذہب سے تعلق اب محض برائے نام رہ گیا تھا اور جسے کچھ مخصوص حالات میں یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا قومی تشخص ختم ہو جائے گا اور وہ ایک بڑی قومیت میں جذب ہو کر رہ جائے گی۔ اس خالص قومی تحریک کے آخری ایام میں خالص وقتی اور عارضی طور پر کچھ رنگ آمیزی دینی و مذہبی جذبے کی بھی کی گئی تھی' لیکن یہ سب کچھ ایک فوری ضرورت (Expediency) کے تحت تھا' نہ کہ کسی مستقل اور محکم اساس پر---- چنانچہ جب تحریک ایک حد تک کامیاب ہو گئی اور اس قوم کو اپنے معاشی و سیاسی تحفظ کی ضمانت کے طور پر ایک علیحدہ خطہ مل گیا تو وہ جوش و خروش بھی فوراً ختم ہو گیا---- اور دوبارہ اس کا سراغ کبھی ملا تو صرف اس وقت جب ایک بار پھر ۶۵ء میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں قوم کا یہ دفاعی حصار ٹوٹ نہ جائے---- اور ہندو امپیریلزم کا سیلاب اس قوم کو بہا کر نہ لے جائے---- پھر جونہی یہ خطرہ دوبارہ ٹلا وہ جذبہ بھی سرد پڑ گیا---- ! اور پھر وہی صورتحال طاری ہو گئی ع

"اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر!"

یہ ہیں وہ حقائق جن کا ادراک اس لئے ضروری ہے کہ ملک و ملت کا ہر بہی خواہ اچھی طرح سمجھ سکے کہ مسئلے کی حقیقی نوعیت کیا ہے---- اور اصلاحِ احوال کے لئے کس جگہ سے کام کی ابتدا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ علاج کی کامیابی کا سارا دارومدار تشخیص کی صحت و درستی پر ہے---- ہمارا مرض سطحی نہیں' بہت گہرا اور نہایت مُزمن ہے' اس کا علاج بھی سطحی تجاویز سے نہیں' بڑی گہری حکیمانہ تدبیر ہی سے ممکن ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی جرأت شاید ہی کوئی کر سکے کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں محض وجود و بقا بھی اسلام ہی سے وابستہ ہے--- لیکن خوب

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اسلام اِس وقت ہمارے عقیدہ و عمل دونوں سے خارج ہو چکا ہے اور اب اس کی بازیافت محض نعروں، تقریروں، مقالوں اور بیانوں سے ممکن نہیں----

اس کے لئے مسلسل اور پیہم کام کرنے اور پیہم جِدّوجُہد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس جدّوجہد کا اصل اور اولین میدان علم و فکر کا میدان ہے----- اور علم و فکر کا رشتہ ایمان و یقین کے ساتھ از سرِ نو استوار کرنا وقت کی اہم ترین اور مقدم ترین ضرورت ہے ---- پھر اخلاق و اعمال کی دنیا میں انقلاب لانا لازمی ہے----- اس لئے کہ تطہیر فکر اور تزکیۂ اخلاق کی کٹھن مہموں کے سر ہونے کے بعد ہی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ قوم کے رگ و پے میں دینی و اسلامی جذبہ سرایت کر جائے اور "اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی صورت عملاً پیدا ہو۔

ہماری ان گزارشات سے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو یہ بدگمانی پیدا ہو کہ شاید ہم فوری طور پر اسلامی نظام کے قیام کی کوششوں کے حامی نہیں، یا یہ کہ ہم پر مایوسی کا غلبہ ہے ----- حالانکہ درحقیقت صورتِ واقعہ نہ تو یہ ہے نہ وہ---- ہم تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کی ہر کوشش کی دل سے قدر کرتے ہیں اور خود بھی بحمداللہ اپنی صلاحیتوں کی حقیری پونجی کو اسی مقصد کے لئے کھپا دینے کا عزم مصمم رکھتے ہیں۔ پھر ہم یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ بہت جلد انسانیت اپنے مسائل کے حل اور اپنے دکھوں کے مداوا کے لئے اسلام ہی کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہو گی اور وہ دَور زیادہ دُور نہیں جب پورے عالمِ ارضی پر اسلام ہی کا غلبہ ہو گا---- لیکن اس کے لئے کیا کام ----- اور کس طرح سے کیا جانا چاہئے، اس کے بارے میں ہمارا ایک پختہ نقطۂ نظر ہے اور ہم علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ یہ کام کس نہج پر کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں دکھ ہوتا ہے تو اس وقت، اور ہمارے لہجے میں تلخی پیدا ہوتی ہے تو تب جب ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے بھلے سمجھدار لوگ اس معاملے میں غالباً صرف تساہلِ فکر کی بنا پر محض سطحی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور مسئلے کی حقیقی و واقعی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے--- اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں ایک بے اختیار ہُوک اٹھتی ہے اُس وقت جب ہمیں خیال آتا ہے کہ برِّصغیر کی ایک اچھی بھلی دینی تحریک جو صورتحال کی صحیح تشخیص

کے ساتھ ایک بہت حد تک صحیح طریق کار پر بر سرِ عمل ہوئی تھی-----وہ بھی قیامِ پاکستان کے وقت، حالات اور مواقع کی ایک وقتی سی ترغیب و تحریص (Temptation) کے زیرِ اثر اپنے موقف سے منحرف اور اپنے نہجِ کار سے دستبردار ہو گئی اور سطحیتِ فکر و عمل کا شکار ہو کر وہی خالی نعرے لگانے میں مصروف ہو گئی جن کی شدید مذمت ماضی میں وہ خود کرتی رہی تھی-----اور آج بھی جبکہ تقریباً رُبع صدی گزر چکی ہے وہ سیاست کے ریگزار میں حکومت و اقتدار کے سراب کے پیچھے بھٹکتی پھر رہی ہے، فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ----اس تحریک کا خیال ہمیں بار بار اس لئے آتا ہے کہ خود ہم نے اسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی تڑپ اسی کے طفیل پائی تھی۔

گزشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر یہ خلش دل کی بآسانی نہیں جاتی!

دین و مذہب سے قطعِ نظر کہ وہ بے چارے تو ہمارے یہاں اب صرف "بوقتِ ضرورت" استعمال کے لئے رہ گئے ہیں۔ اور اسلام و ایمان کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہ وہ غریب صرف لیڈروں کی تقریروں کا مطلع و مقطع فراہم کرنے کے کام آتے ہیں، خالص قومی سطح پر بھی غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ہم زندہ قوموں کے لازمی اوصاف سے خطرناک حد تک تہی دست ہیں اور اس میدان میں بھی ہماری تہی دامنی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے-----ہماری قومی و ملی زندگی جس طرح پے بہ پے حادثوں سے دوچار ہو رہی ہے اور ملکی سیاست کی گاڑی جس طرح بار بار زور دار جھٹکوں کے ساتھ رک جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ آزادی ایسی نعمتِ عظمیٰ کے حصول سے قبل قومی تعمیر کا کام جس حد تک لازماً ہو جانا چاہئے تھا وہ ہمارے یہاں نہیں ہوا۔ اور اس عظیم ذمہ داری سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ ناگزیر حد تک بھی پیدا نہیں ہوئیں۔ گویا آزادی ہمیں ایک ایسے عطیہ کی حیثیت سے ملی جس کے لئے ہم عملاً تیار نہ تھے۔

یہ صورتِ حال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جس سے بعض وہ طالب علم جو

نچلے درجوں میں رعایتی پاس ہوتے چلے آتے ہیں کسی بڑے امتحان کے موقع پر دوچار ہو جاتے ہیں ---- کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی ان کی وہ بنیادی کمی کسی طرح پوری نہیں ہوتی جو بالکل ابتدا میں رہ گئی تھی!

برِصغیر کی ہندو قوم میں قومی تعمیرِ نو کا کام انیسویں صدی کے اواخر ہی سے شروع ہو گیا تھا اور بیسویں صدی کی ابتدا سے تو اس میں بے پناہ جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر جہت اور ہر سمت میں تعمیر و اصلاح کا کام تیزی کے ساتھ شروع ہوا' بے شمار انجمنیں بنیں' لاتعداد ادارے وجود میں آئے' ہزاروں ٹرسٹ قائم ہوئے' چھوٹی بڑی لاکھوں درس گاہیں تعمیر ہوئیں ------ اور لکھو کھا قومی کارکن جذبۂ اخلاص کے مظہر' سادگی و کفایت شعاری کے پیکر اور مجسم قربانی و ایثار بن کر میدانِ عمل میں کود پڑے ---- پھر تعمیرِ جدید کا یہ کام کسی ایک ہی میدان میں نہیں ہوا بلکہ ایک طرف اگر سیاسی میدان میں ہلچل اور ہماہمی تھی تو دوسری طرف خالص معاشرتی اور سوشل اصلاح اور معاشی فلاح و بہبود کے لئے بھی زور شور سے کام جاری تھا۔ اور ایک طرف مذہبی اصلاح و تجدید کی کوششیں ہو رہی تھیں اور مذہبی افکار کے تنقیدی جائزے اور ان میں شکست و ریخت اور تالیفِ جدید سے نئے نئے دھرم ایجاد ہو رہے تھے تو دوسری طرف صحت و تندرستی کے اصولوں کے پرچار اور ورزش و ریاضت کے عملی پروگراموں سے جسم اور جسمانی قوتوں کے نشوونما کا کام بھی پورے انہماک سے ہو رہا تھا ---- غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک نئی ہلچل اور نئی سرگرمی پیدا ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں پوری ہندو قوم میں بیداری اور حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فی الجملہ آزادی کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور استعداد اس میں پیدا ہو گئی۔

مسلمان قوم میں صورت اس کے برعکس رہی۔ اس کی اکثریت "عظمتِ رفتہ" کی یاد ہی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی اور "پدرم سلطان بود" کا راگ الاپ کر ہی دل کو تسلی دیتی رہی۔ قومی و ملی تعمیرِ جدید کا کام تقریباً نہ ہونے کے برابر رہا اور تعطل اور جمود کا تسلط اور بدنظمی' انتشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ دفعۃً محسوس ہوا کہ غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ ہونے کو ہے اور اس صورت میں ہندوستان کی مسلمان قوم ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ چنانچہ فوری طور پر اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضرورت محسوس ہوئی اور جیسے تیسے ایک قومی تحریک

اٹھی جسے ابتداءً صرف کچھ نوابوں اور جاگیرداروں کی پشت پناہی حاصل تھی اور جس کا دائرۂ کار ابتدا میں صرف کچھ آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر قوم کے وہ مذہبی طبقات اس سے بدظن بھی ہو گئے جو حریت و آزادی کی راہ میں مسلسل قربانیاں دیتے آئے تھے اور جن میں عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی اور اس طرح قوم بے شمار مخلص کارکنوں سے محروم ہو گئی---- آزادی سے متصلاً قبل ایک دو سال کے لئے اس قومی تحریک میں بھی کچھ عوامی رنگ پیدا ہوا تھا' لیکن ابھی اس کے کارکن بالکل خام حالت ہی میں تھے کہ آزادی کی گھڑی آ پہنچی اور اللہ تعالیٰ کے ایک خصوصی عطیہ اور انعام کے طور پر اس قوم کو بھی ایک علیحدہ آزاد مملکت مل گئی۔

پھر آزادی کیا ملی---- گویا دولت و ثروت کا سیلاب آگیا جو قوم کی دیانت و شرافت اور خلوص و اخلاص کی رہی سہی پونجی کو بھی بہا کر لے گیا۔ اولاً متروکہ دولت پر چھینا جھپٹی ہوئی' پھر تجارت و صنعت کے میدانوں میں دولت کے دریا بہنے لگے' دیکھا دیکھی سرکاری ملازموں نے بھی ہاتھ رنگنے شروع کئے اور دشتِ دولت کے "ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج" وصول کرنا شروع کیا---- غرض پوری قوم کے سر پر دولت کا بھوت سوار ہو گیا---- قومی تعمیرِ نو کا کام پہلے ہی نہیں ہوا تھا جبکہ اس کے لئے تمام تر اسباب و عوامل بھی موجود تھے تو اب کیا خاک ہوتا! خلوص' دیانت' ایثار اور قربانی نام کی کوئی شے پہلے کہیں کچھ موجود تھی تو اس دَور میں بالکل ختم ہو گئی۔ ذمہ داری' احساسِ فرض' تندہی اور محنت کالعدم ہو گئے۔ سیاست نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کر لی اور روپے پیسے یا زیادہ سے زیادہ کنبہ و برادری کے سوا اس میدان میں کوئی سکہ رواں نہ رہا۔ چنانچہ طبقہ متوسط کے وہ لوگ جو قومی تحریک کے آخری ایام میں ملی و قومی جذبات کے تحت سیاست کے میدان میں آ گئے تھے رفتہ رفتہ مایوس اور بددل ہو کر اسے خیرباد کہہ گئے اور سیاست اور حکومت کا پورا معاملہ صرف بڑے زمینداروں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا مشغلہ بن کر رہ گیا۔ ان میں سے جو کبھی کسی وجہ سے مات کھا جاتا تھا ایسے خاموش اور بیکار ہو کر بیٹھ رہتا تھا جیسے سیاست بازی کے علاوہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لئے کرنے کا کوئی اور کام ہے ہی نہیں---- نتیجتاً سیاسی اختلال پیدا ہوا' جوڑ توڑ اور سازش کا بازار گرم ہوا' حکومتیں آئے دن بدلنے لگیں' بین الاقوامی ساکھ اور قومی و ملکی معیشت کا دیوالہ نکل گیا---- تو پہلا مارشل لاء لگا---- جس نے کچھ عرصہ کے لئے ان امراض کی ظاہری علامتوں کو دبا دیا۔ لیکن جونہی خالص فوجی حکومت سے کسی قدر سیاسی و دستوری حکومت کی طرف رجعت

ہوئی وہی پہلا سماں پھر بندھ گیا اور علاماتِ مرض پھر ظاہر ہو گئیں ------ بلکہ حالت پہلے سے بد تر ہو گئی ----!!

یہ ہیں وہ حالات جن سے ہم بحیثیتِ قوم دوچار ہیں --- کہ قوم کے سوادِ اعظم کے پیش نظر نہ کوئی نظریہ ہے نہ مقصد' نہ قومی و ملی ذمہ داریوں کا احساس ہے نہ شہریت کے فرائض کا --- پھر نہ کوئی مستحکم قومی تنظیم موجود ہے نہ قابلِ اعتماد قومی قیادت۔ سیاسی شعور کی کمی کا یہ حال ہے کہ جو چاہے وقتی طور پر نعرے لگائے اور عارضی طور پر قوم کو اپنے پیچھے لگا لے --- اور قیادت کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ جس شخص کے بارے میں ذرا یہ معلوم ہو کہ دیانت دار اور مخلص آدمی ہے' قوم بالکل یتیموں کی طرح سرپرستی کے لئے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیتی ہے' چاہے وہ سیاست کے میدان میں بالکل نووارد ہی ہو اور سیدھا کسی سرکاری محکمے کی ملازمت سے فارغ ہو کر چلا آ رہا ہو ----وَقِس علٰی ھٰذا!

اس میں شک نہیں کہ حال ہی میں بعض گروہ ایسے بھی سامنے آئے ہیں جو کچھ واضح نظریات بھی رکھتے ہیں اور کسی قدر محکم تنظیمی سلسلے بھی' لیکن چونکہ ابھی ان کا حلقہ اثر بہت محدود ہے وہ وسیع تر ملی و قومی تقاضوں کا جواب نہیں بن سکتے۔

> یہ حالات متقاضی ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے ان کو ادا کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہو جائے اور ان بنیادی کمزوریوں' کمیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کے لئے کوشاں ہو جو عرصۂ دراز سے چلی آ رہی ہیں اور اس طرح دین و مذہب' علم و فکر' تعلیم و تربیت' تطہیرِ اخلاق و عمل' سماجی و معاشرتی اصلاح' قومی و ملی تنظیم غرض ہر میدان میں اصلاح و تعمیر کا عمل تیزی سے شروع ہو جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم بحیثیتِ ملک و ملت اس وقت موت و زیست کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قدرت کی جانب سے عطا کردہ مہلت ہماری غفلت میں اضافے کا موجب ہو۔ اور پھر قانونِ خداوندی کا کوئی کوڑا ہم پر اچانک برس پڑے!

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ --- آمین!

باب سوم

"مری تعمیر میں مضمر تھی کچھ صورت خرابی کی!"

جولائی ۱۹۶۹ء

میڈیکل کالج لاہور میں اپنے پانچ سالہ عرصہ تعلیم کے دوران راقم الحروف نے معمارِ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کا حسب ذیل فقرہ جو کالج ہال کی دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھا ہوا تھا، بلا مبالغہ سینکڑوں مرتبہ پڑھا ہوگا۔

"GOD HAS GIVEN US A GOLDEN OPPORTUNITY TO SHOW OUR WORTH AS ARCHITECTS OF A NEW NATION (OR STATE?) AND LET IT NOT BE SAID THAT WE DID NOT PROVE EQUAL TO THE TASK!" {۱}

پھر کچھ تو اس بنا پر کہ فقرہ بجائے خود نہایت جاندار تھا اور اس کے الفاظ کا در و بست نہایت موزوں تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا اور ہر پاکستانی مسلمان کے دل میں ایک "ولولۂ تازہ" موجزن تھا اور اس جملے میں گویا ہر شخص کو اپنے ہی دل کی صدا سنائی دیتی تھی۔ یہ فقرہ کچھ اس طرح ذہن میں ثبت ہو گیا تھا کہ آج تک من و عن یاد ہے۔

لیکن ----- افسوس ----- کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا مملکتِ خداداد پاکستان بزبانِ حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی و مؤسس کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسر نہ آسکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق "اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے!" {۲} ----- بائیس سال گزر

{۱} یعنی "(مملکت خداداد پاکستان کی صورت میں) اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نئی قوم (یا مملکت؟) کے معماروں کی حیثیت سے اپنی اہلیت و صلاحیت کے اظہار کا ایک سنہری موقع عطا فرمایا ہے اور دیکھنا! ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیا یہ کہے کہ ہم اس عظیم کام کے اہل ثابت نہیں ہو سکے!"

{۲} THEY BUILD A NATION'S PILLARS DEEP, AND LIFT THEM TO THE SKY!

جانے کے بعد بھی اگر کسی مملکت کا "اساسی نظریہ" تک زیر بحث چلا آرہا ہو اور دستور سازی ہنوز معرضِ بحث میں ہو بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے بارے میں نئی نئی بحثیں اٹھ رہی ہوں اور ردّ و قدح اور تکرار و نزاع کی نت نئی صورتیں پیدا ہو رہی ہوں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساری مادی ترقیوں اور معاشی منصوبہ بندیوں کے باوجود ابھی مملکت کی اصل تعمیر کی ابتدا بھی نہیں ہوئی اور قومی تعمیرِ نو کا کام شروع بھی نہیں ہو سکا۔

پاکستان کی زندگی کے بائیس سال درحقیقت گیارہ گیارہ سالوں کے دو مساوی ادوار پر مشتمل ہیں۔ پہلے گیارہ سالوں (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء) کے دوران پاکستان کے سیاست دانوں کی نااہلی و ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی --- اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن بہت جلد اس نے ایک سابق فوجی کے زیر سربراہی ایک خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کر لی اور اہل سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا۔ چنانچہ دوسرا دور (۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۹ء) درحقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی۔ لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساسِ فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کماحقہٗ ادا کرنے کے لئے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آپڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نااہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا --- اور اس طرح یہ دَور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد --- ملک و ملّت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا ہے یعنی فوج، چنانچہ بدرجۂ مجبوری پھر اسی کو آگے بڑھ کر ملک و ملت کی زمام اپنے ہاتھ میں لینی پڑی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ شرافت، دیانت، امانت، حبِّ وطن، حبِّ قوم، ایثار، قربانی، احساسِ فرض اور

تن دہی و جانفشانی کے اوصاف کے اعتبار سے قوم اپنے اس طبقے پر مکمل اعتماد بھی کرتی ہے---- لیکن ظاہر ہے کہ اس ادارے کا اصل فریضہ دفاعِ وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیش نظر مستقبل میں دفاعِ وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاعِ وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ (risk) اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف ملک کی سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کی صفوں میں خاصی سرگرمی اور ہلچل کے باوجود تاحال کوئی ایسی صورت سامنے نہیں آ رہی ہے کہ یہ امید کی جا سکے کہ اگر حکومت ان کے حوالے کر دی جائے تو یہ اطمینان بخش طور پر اسے سنبھال سکیں گی اور دوبارہ وہی صورتحال پیدا نہ ہو جائے گی جس کے پیش نظر مارشل لاء کا نفاذ لازمی ہو گیا تھا۔

الغرض---- نظریاتی اور دستوری بحثوں اور مناقشوں پر مستزاد یہ ہے وہ نازک صورتحال اور عظیم الجھاؤ (dilemma) جس سے مملکتِ خداداد پاکستان اِس وقت دوچار ہے۔

اس صورتحال کے اسباب میں سے تین عوامل تو ہماری گزشتہ نصف صدی کی تاریخ سے متعلق ہیں اور تین پیچیدگیاں وہ ہیں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہوئیں اور مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ٭٭٭

تاریخی عوامل کے بارے میں ہم ان صفحات میں مفصل لکھ چکے ہیں اور یہاں ان کے مفصل اعادے کی گنجائش بھی نہیں۔ مختصراً وہ یہ ہیں کہ :

اولاً---- آج سے تقریباً نصف صدی قبل ملّتِ اسلامیہ ہندوپاک کی قوتیں اور توانائیاں منقسم ہو گئیں اور قومی لائحہ عمل اور پالیسی سے اختلاف کی بنا پر علماء کا وہ طبقہ جو ماضی میں قوم کا اصل رہنما رہا تھا اور جس میں مخلص اور بے لوث عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی اپنے متوسلین سمیت قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ کر رہ گیا اور اس طرح قوم اپنی بہترین متاع سے محروم

ہو گئی۔ رہا یہ سوال کہ یہ حادثہ کیسے اور کیوں واقع ہوا' تو یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس پر گفتگو کی اس وقت گنجائش نہیں۔(یہ تحریر اب "اسلام اور پاکستان" نامی کتاب میں شامل ہے!)

ثانیًا---اسلامیانِ ہند کی قومی قیادت قومی تعمیرِ نو اور قوم کی تنظیم و تربیت کے ضمن میں ہرگز کوئی قابل ذکر کام نہیں کر سکی۔ اب چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ اسے اس کا وقت نہیں ملا' چاہے یہ کہ اس نے اس کی جانب توجہ نہیں کی' فرق کوئی واقع نہیں ہوتا۔ اور واقعہ بہرحال یہی ہے کہ قومی تحریک نے بس ایک ہنگامی اور فوری سی ضرورت کو تو ضرور پورا کر دیا لیکن اس نے قوم کو نہ کوئی قومی تنظیم دی نہ قومی قیادت!

ثالثًا--- قیامِ پاکستان سے تقریباً ایک دہائی قبل ایک اور صاحب نے "قومی تحریک" کو مطعون کر کے ایک "بین الاقوامی اور خالص اصولی اسلامی تحریک" کے نام پر قوم کے جسد سے مخلص کارکنوں کا ایک اور ٹکڑا کاٹ لیا اور قیام پاکستان کے فوراً بعد اسی "ٹکڑی" کی مدد سے "اسلامی دستور" اور "انقلابِ قیادت" کے نعروں کے ساتھ قومی قیادت پر ایک زوردار شبخون مارا ---- نتیجتاً قومی قیادت کے رہے سہے مخلص عناصر کو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ایک جانب قومی تنظیم کے اندرونی خلفشار کا سامنا کرنا پڑا اور دوسری طرف ان صاحب کی بیرونی یلغار کا۔ اس دوگونہ کشمکش نے قومی قیادت کے ان مخلص عناصر کو کمزور کرتے کرتے بالآخر بالکل میدان سے خارج (knock out) کر دیا اور میدان بالکلیہ ان لوگوں کے ہاتھ آ گیا جن کا کوئی دین تھا تو خالص اغراض پرستی اور ایمان تھا تو محض مفادات پر اور جو کبھی یونینسٹ ہوتے تھے' کبھی لیگی۔ پھر کبھی ری پبلکن بن جاتے تھے اور کبھی پھر لیگی!----ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں پاکستان کی قومی سیاست کے تابوت میں وہ آخری کیل ٹھکی جس کے بعد خالص بیوروکریسی کا دور شروع ہو گیا۔ (ان تینوں امور پر ہماری مفصل تحریریں "اسلام اور پاکستان" نامی کتاب میں شامل ہیں)

ان تین تاریخی عوامل پر مستزاد ہیں وہ تین پیچیدگیاں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے---- آئندہ ہم ان کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے یعنی یہ کہ مملکتِ خداداد پاکستان دو ایسے علیحدہ اور دُور دراز خطوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے مابین ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالتِ جنگ ہی میں نہیں عین حالتِ امن میں بھی ایک بالقوہ دشمن (Potential Enemy) کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ پاکستان کا وجود ہر اعتبار سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اس اعتبار ہی سے تو یہ تاریخِ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور محیر العقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی، لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دوگونہ کر دیا ہے ---- یعنی ایک اس حقیقت نے کہ تہذیب، تمدن، زبان، لباس، طرزِ بود و باش اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروّجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا ---- اور دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خطوں میں سے جو خطہ، رقبہ، محلِ وقوع، دفاع اور تعمیر و ترقی کے امکانات، الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے وہ بلحاظِ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم امور کے اعتبار سے بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے {۲} بلکہ ایک نہایت جاندار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریئے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لئے ہوئے ہے، تعدادِ نفوسِ انسانی کے لحاظ سے دوسرے خطے سے برتر ہے ---- ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل کی بنا پر اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے

{۲} ممکن ہے ہماری یہ عریاں حقیقت نگاری بعض لوگوں کو ناگوار معلوم ہو اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی سیاسی کارکن اس حقیقت کے اظہار کی جرأت نہیں کرے گا۔ تاہم ہمارے نزدیک واقعہ یہی ہے اور اسے ذہنی طور پر قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روزِ اول کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دُور دُور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے!!

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیش نظر رہنی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس "سنجوگ" کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی ہی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جاسکتا۔ بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا ردِ عمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس "آزاد مرضی" کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملی احساسات پر ہے اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی "علیحدگی" کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لئے تو پھر بھی امکانِ غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا' لیکن مشرقی پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل ہے کیا؟---اگر وہ واقعتاً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آسکتی۔ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دین

فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے اگرچہ طلاق' حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم "معلق" رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کرلی جائے ---- بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعتاً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل "معطل" رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔

ہم نے اوپر بھی عرض کیا تھا---اور اب مزید وضاحت سے کہے دیتے ہیں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین "مساوات" کا مفہوم اگر یہ ہے کہ دارالحکومت ایک مغربی پاکستان میں ہو اور دوسرا مشرقی پاکستان میں اور مرکزی حکومت چھ ماہ وہاں رہے اور چھ ماہ یہاں، اور دفاعی اخراجات میں بھی لازماً کامل مساوات برتی جائے تو یہ خالص احمقانہ تصور ہے۔ ایسی مساوات خاندان کے مختصر سے ادارے میں بھی نہیں چل سکتی' کجا یہ کہ ایک عظیم مملکت جو طرح طرح کی پیچیدگیوں سے دوچار ہو' اس کے انتظام و انصرام میں برتی جاسکے۔ اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ دونوں خطے آزاد ہو کر اپنے اپنے بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کی فکر کریں----!!

لیکن ہمیں یقین ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہش ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوں۔ اور اگرچہ ماضی قریب میں ان پر یہ "بہتان" کثرت سے لگایا گیا ہے کہ ان میں "علیحدگی پسندی" کا رجحان موجود ہے ہم یہ باور نہیں کرسکتے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان حقائق و واقعات اور موجود الوقت ظروف و احوال سے اتنے بے خبر ہو سکتے ہیں کہ ان خطرات کا اندازہ نہ کر سکیں جو ایسی کسی تجویز میں لازماً مضمر ہیں---- ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ بس "صوبائی خود اختیاری" کے حصول کی خواہش ہے اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صوبائی معاملات میں انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور یہ ہمارے نزدیک ان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کسی بھی معقول انسان کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اور مرکزی حکومت کے مؤثر طور پر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو امور ضروری ہیں انہیں مرکز کی تحویل میں دینے کے بعد بقیہ تمام معاملات میں مشرقی پاکستان کو کامل صوبائی خود اختیاری لازماً ملنی چاہئے۔

انہی متذکرہ بالا دو امور کی روشنی میں دستور کے مسئلے پر بھی ایک بار حتمی طور پر فیصلہ کر لینے

کی شدید ضرورت ہے اور تمام حالات و واقعات کا مردانہ وار مواجہہ کر کے اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لینا لازمی ہے۔ اور اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک کسی مملکت کے انتظام و انصرام میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت دیانت و امانت کو حاصل ہے نہ کہ قواعد و ضوابط اور تدابیرِ تحدید و توازن (CHECKS AND BALANCES) کے اس بے جان ڈھانچے کو جسے "دستور" کہا جاتا ہے تاہم ہمارے یہاں جو خلاء اس میدان میں چلا آ رہا ہے اسے ایک بار جرأت و ہمت کے ساتھ عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق پر کر لینا ہی بہتر ہے!

دستور کے مسئلے پر ہمارے یہاں اس وقت بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ بہت سے لوگ ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی کے خواہاں ہیں' اگرچہ وہ ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر رہے ہیں کہ اس میں بنیادی ترمیموں کی ضرورت ہے اور اگرچہ خان قیوم خان نے ایک علیحدہ آواز بلند کی ہے یعنی یہ کہ فی الحال ایک عبوری دستور نافذ کر دیا جائے' لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "دائیں بازو" نے اپنے حلقہ اثر کی تمام جماعتوں اور شخصیتوں کو اس معاملے میں تقریباً متفق کر لیا ہے (جس کی تازہ ترین مثال شیخ مجیب الرحمٰن کا بھی ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی سے متفق ہو جانا ہے) دوسری طرف ایک مطالبہ یہ ہے کہ بالغ حقِ رائے دہی کی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں آئے اور اسے ایک معین مدت (مثلاً چھ ماہ) کے اندر اندر دستور سازی کا پابند کیا جائے ---- بعد میں یہی اسمبلی پارلیمنٹ کی حیثیت سے کام کر سکتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی دوسری رائے منطق کے ہر اصول کے مطابق اقرب الی الصواب ہے اور اگرچہ ہمیں' جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا' ۱۹۵۶ء کے دستور سے بھی کوئی کد نہیں' تاہم ہمارے نزدیک حقیقت یہی ہے کہ ہمارے یہاں اب تک کی کسی دستوری دستاویز کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی پشت پر عوام کی مرضی اور رائے موجود ہے۔ اور ان میں سے کسی کو بھی آئندہ انتخابات کی بنیاد بنایا گیا' تو یہ اعتراض جائز طور پر موجود رہے گا کہ ایک غیر نمائندہ دستور کے تحت منعقد شدہ انتخابات کے نتائج بھی قابل اعتماد نہیں قرار دیئے جا سکتے ---- ہمارے نزدیک صدرِ مملکت محمد یحییٰ خاں کی وہ رائے نہایت صحیح ہے جو انہوں نے خان قیوم خاں کی متذکرہ بالا تجویز کے جواب میں ظاہر کی ہے' یعنی یہ کہ موجودہ مارشل لاء خود ایک "عبوری دستور" کی ضرورت پوری کر رہا ہے ---- اب اس معاملے میں جو اقدام بھی ہو وہ عارضی اور عبوری اور پیشگی طور پر واجب

الترمیم نوعیت کا نہیں ہونا چاہئے بلکہ ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لیا جائے ----اور ظاہر ہے کہ اس کی کوئی صورت اس مؤخر الذکر تجویز کے سوا ممکن نہیں۔

دوسری بڑی پیچیدگی جو گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہے اور روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے یہ ہے کہ اپنے اول یوم پیدائش ہی سے پاکستان کو ایک ایسی مملکت کی عداوت و دشمنی کا سامنا ہے جو ایک طرف تو نہ صرف یہ کہ اس کے بالکل قریبی ہمسائے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ پاکستان کے دونوں خطوں کے مابین حائل ہونے کی بنا پر گویا پاکستان کے چھوٹے سے جسم میں ایک بہت بڑے خنجر کی طرح پیوست ہے اور دوسری طرف اپنی وسعت' قوت' آبادی اور وسائل تمام اعتبارات سے پاکستان سے کم از کم چوگنی ہے۔{۳}

بھارت کی یہ مستقل عداوت نہ صرف یہ کہ ہمارے محدود وسائل و ذرائع پر ایک بہت بڑے بوجھ کا سبب بنی رہی ہے جس کی بنا پر اس نوزائیدہ مملکت کی تعمیر و ترقی کے جملہ امکانات بروئے کار نہ آسکے ----بلکہ بدقسمتی سے اسی ایک مرکز کے گرد ہماری پوری خارجہ حکمتِ عملی کو ہمیشہ گھومنا پڑا ہے۔

اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو گزشتہ بائیس سالوں کے دوران دو دور گزر چکے ہیں اور اب تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے ---- پہلا دور آرام و آسائش بلکہ عیش اور گلچھروں کا دور تھا۔ دوسرے میں ہمیں نسبتاً مشکل تر حالات کا سامنا کرنا پڑا اور اب جو دور شروع ہو رہا ہے آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ہمیں اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت شدید جدوجہد اور محنت و مشقت کا سامنا کرنا ہو گا۔

{۳} اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بھارت اور اسرائیل میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں دنیا کے نقشے پر اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل خنجروں سے مشابہ ہیں۔ ایک بلادِ عرب کے سینے میں پیوست ہے اور دوسرا اسلامیانِ پاکستان کے جسد میں ---- بلادِ عرب اگر وسعت میں زیادہ ہیں تو اسلامیان پاکستان تعداد میں مسلمانانِ عرب کی مجموعی تعداد سے بھی کئی گنا زیادہ ہیں۔ اور اسرائیل بھارت کے مقابلے میں چاہے بہت چھوٹا ہے لیکن مغربی استعمار کی پشت پناہی کی بنا پر بھارت سے کسی طرح بھی کمزور نہیں!

پہلے دور میں دنیا کی بڑی طاقتیں دو دھڑوں میں منقسم تھیں۔ایک طرف روس اور چین پر مشتمل کمیونسٹ بلاک تھا اور دوسری طرف اینگلو امریکی اتحاد۔اور ان کے مابین شدید کش مکش اور مسلسل جنگ جاری تھی جو کبھی گرم ہو جاتی تھی کبھی سرد۔بھارت نے ایک نئی طاقت کی حیثیت سے ان کے مابین "ثالثی" کا کردار اختیار کرنے کی کوشش کی اور اپنی نام نہاد آزاد اور غیر جانب دار خارجہ پالیسی کے نام پر خصوصاً مغربی بلاک کو پریشان کرنا شروع کیا۔اس صورت حال کا عروج تھا وہ وقت جب ہندوستان میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے لگ رہے تھے!اس وقت مغربی بلاک کو شدید ضرورت تھی کہ اس علاقے میں کوئی ملک ایسا ہو جہاں اس کے قدم بھی کسی قدر جم سکیں۔ ان کی اس ضرورت کو اپنی خارجہ حکمت عملی میں فٹ پا کر پاکستان نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ یہ وہ دور تھا جب ہم پر چچا سام نہایت مہربان تھے اور ہمارے ہر طرح کے ناز نخرے برداشت کرنے کو تیار تھے-----!! اور دوسری طرف ہم بھی ان کے کامل نیاز مند تھے اور ان کے اشارے پر کبھی سیٹو میں حاضری دیتے تھے کبھی سنٹو میں-----!!

اس کے بعد حالات بدلے۔ایک طرف چین اور روس کے مابین اختلافات کی خلیج نمودار ہوئی' دوسری طرف روس کا رویہ مغربی اتحاد کے ساتھ بدلنا شروع ہوا' تیسری طرف بھارت کو "عقل" آئی اور اس نے اندر ہی اندر چچا سام سے تعلقات استوار کر لئے-----اور چوتھی طرف روس' مغربی اتحاد اور بھارت تینوں نے چین کو اپنے مشترک دشمن کی حیثیت دینی شروع کر دی ----- نتیجتاً بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ حکمت عملی کے میدان میں ہم نے جس زمین پر تعمیر کی تھی وہ پیروں تلے سے کھسکنی شروع ہو گئی-----اور بھارت کو امریکہ اور روس دونوں کے منظورِ نظر کی حیثیت حاصل ہو گئی----یہ ہمارے لئے مشکلات کے دور کا آغاز تھا۔اس دور کے بالکل ابتدا میں ایک کوشش امریکہ نے یہ کی بھی کہ کسی طرح بھارت اور پاکستان کے مابین ایسی مکمل "مفاہمت" کرا دی جائے کہ یہ دونوں سوکنوں کی بجائے بہنوں کی صورت اختیار کر لیں اور دونوں ہمارے اشاروں پر یکساں حرکت کر سکیں۔اسی غرض سے اس نے پنجاب کے دریاؤں کے پانی کے مسئلے کو جیسے تیسے حل کرانے کا کھکھیڑ مول لیا اور بعض دوسرے معاملات میں بھی صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ان کوششوں کا عروج (CLIMAX) تھی وہ تجویز جو امریکہ نے سابق صدر ایوب کے ذریعے پیش کرائی کہ پاکستان اور ہندوستان کا دفاع مشترک ہو جائے-----اس تجویز

پر پنڈت نہرو کے احمقانہ ردِ عمل سے اس معاملے میں "ANTI-CLIMAX" کے دور کا آغاز ہوا۔ اور پاکستان میں آزاد خارجہ حکمت عملی کا دور شروع ہو گیا۔

اب ظاہر ہے کہ کسی کے گھڑے کی مچھلی بنے رہنے میں جو آسانی اور عافیت ہے وہ اپنی آزاد رائے اور آزادانہ حیثیت و تشخص کو برقرار رکھنے اور دوسروں سے منوانے (یعنی ASSERT کرنے) میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ آزادی بہرحال جدوجہد اور محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کا مطالبہ کرتی ہے ---- چنانچہ اس دور میں ہمیں لامحالہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔

اور اب جس تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے وہ اسی صورت حال کی گویا ایک منطقی انتہا کا دور ہے۔ اِس وقت جن حالات سے ہم دوچار ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک طرف صاحب برطانیہ بہادر تو بالکل ہی اپنی بساط مشرق سے لپیٹ گئے ہیں' خود چچا سام بھی پہلے کوریا اور پھر ویٹ نام میں اس قدر مار کھا چکے ہیں کہ اب اس علاقے سے کسی قدر باعزت طور پر کھسک جانے ہی میں عافیت محسوس کر رہے ہیں۔ دوسری طرف روس نے امریکہ کی خاموش رضا کے تحت اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی پاؤں پسارنے شروع کر دیئے ہیں اور تیسرے جنوب مشرقی ایشیا میں ان دونوں کا اصل اتحادی بھارت اور اصل دشمن چین بن چکا ہے ---- اور اب امریکہ' روس اور بھارت تینوں مل کر زور لگا رہے ہیں کہ ہم ان کے تابع مہمل بن کر ان کی مرضی کے مطابق چین کی مخالفت میں ان کا پسندیدہ کردار ادا کریں اور اس علاقے میں بھارت کے مقابلے میں گھٹیا درجے کی شہریت (SECOND RATE CITIZEN SHIP) قبول کر لیں ---- اس طرح یہ دور ہماری قومی غیرت اور حمیت کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج بن کر شروع ہو رہا ہے اور اس کے لئے ہم پر ہر ممکن دباؤ کو استعمال کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف بھارت نے ایران اور عرب ممالک میں اپنے تجارتی و صنعتی اثر و رسوخ کے جال کو تیزی کے ساتھ بچھانا شروع کر دیا ہے اور یہ امر ہمیں ہوشیار کرنے کے لئے کافی ہونا چاہئے کہ ان ممالک کی جانب سے بھارت کے ان عزائم کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ دوسری طرف بھارت نے افغانستان سے اپنے پرانے معاشقے کی از سرِ نو تازہ جوش و خروش کے ساتھ تجدید کرنی شروع کر دی ہے اور ایک فراخہ بند سے جو خطرہ مشرقی پاکستان کی زرعی معیشت کو تھا' اس کا حل بھی ابھی نہیں ہوا تھا کہ افغانستان سے آنے والے دریاؤں کو خشک کر کے مغربی

پاکستان کی معیشت پر خطرناک وار کرنے کی سکیم پر سوچ بچار شروع ہو گیا ہے۔ تیسری طرف خاص اس موقع پر سرحدی گاندھی سے اندرا گاندھی کی ملاقات' انہیں نہرو پرائز وصول کرنے کے لئے بھارت آنے کی دعوت اور ان کی خدمت میں اسّی لاکھ روپے کی رقم بطورِ نذرانہ پیش کرنے کی سکیم سے بھارت کے عزائم واضح طور پر سامنے آ رہے ہیں----اور بھارت کی ان ساری کوششوں اور تدبیروں پر مستزاد ہیں روس کی تجاویز جو کبھی کوسیجن صاحب کے پیش کردہ معاشی تعاون کے منصوبے کی صورت میں سامنے آتی ہیں اور کبھی برزنیف صاحب کی پیش کردہ "اجتماعی سلامتی" کی سکیم کی شکل اختیار کرتی ہیں----اور ان سب پر ثبت ہے چچا سام کی منظوری و رضامندی کی مُہر جو ایسی تمام تجاویز پر خاموشی یا "محتاط ردِّ عمل" کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

یہ صورت حال ہر غیور اور باحمیت پاکستانی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ کمرِ ہمت کس کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد ہو جائے۔ اس مشکل کے وقت میں ہماری اصل قوتِ مدافعت و مزاحمت ایک آزاد اور باعزت و باوقار ملک و ملت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے ایک شدید داعیے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ داعیہ محض "زندگی برائے زندگی" کے نظریے سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نظریے کے تحت تو انسان بسا اوقات ذلت اور بے عزتی کی حالت کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ یہ داعیہ کسی مقصدِ زندگی سے آشنا ہو کر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے اندر اگر کسی مقصد کا عشق پیدا ہو جائے اور یہ انسانیت کے لئے کسی نظریے اور پیغام کی علمبردار بن کر اٹھ سکے تبھی اس میں وہ ہمت' وہ جرأت' وہ ایثار' وہ قربانی اور محنت و مشقت کا وہ جذبہ بیدار ہو سکتا ہے جو ان حالات میں اس کے بقاو تحفظ ہی نہیں ترقی و استحکام اور عزت و وجاہت کا ضامن بھی بن سکتا ہے----اب ظاہر ہے کہ یہ نظریہ وہی ہو سکتا ہے جس کے نام پر پاکستان قائم ہوا تھا اور وہ پیغام اسلام کے پیغام کے سوا اور کوئی نہیں----گویا جس طرح پہلی پیچیدگی کا اصل اور مستقل حل دینی جذبات اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے میں ہے' اسی طرح اس دوسری پیچیدگی اور اشکال کا اصل حل اور اس سے پیدا شدہ چیلنج کا اصل جواب بھی یہی ہے کہ ہم بحیثیتِ قوم ایمان کے داعی اور اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور اس مقصد کے ساتھ ایک ایسا والہانہ عشق ہمارے اندر پیدا ہو جائے کہ اس کے لئے بڑی سے بڑی محنت اور کٹھن سے کٹھن مشقت ہمیں آسان معلوم ہونے لگے اور بڑے سے بڑا ایثار اور اونچی سے اونچی قربانی حقیر محسوس ہو----!!

اس پیچیدہ صورت حال کا ایک ضمنی تقاضا بھی ہے اور وہ یہ کہ ہماری خارجہ حکمت عملی کو اب دورِ ثانی کے مقابلے میں بھی زیادہ "آزاد" ہونا چاہئے اور اندریں حالات ہمیں عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ اپنے تعلقات پر پہلے سے بھی زیادہ زور دینا چاہئے۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ اس موقع پر ایک طرف "دائیں بازو" کی چوٹی کی قیادت (TOP BRASS) نے بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں چین کی مخالفت میں بڑی طاقتوں (SUPER POWERS) کا آلۂ کار ہرگز نہیں بننا چاہئے اور دوسری طرف وزیر اعظم روس کے دہلی سے واپسی پر "سرِ راہے" ورودِ پاکستان اور اب صدرِ امریکہ کی خلائی جہاز کی واپسی کے منظر کو دیکھنے کے بعد ٹہلتے ٹہلاتے پاکستان کو بھی نوازتے جانے کے پروگرام سے یہ احساس شدت کے ساتھ ابھرا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم چواین لائی کو بھی جلد پاکستان آنا چاہئے (جس کا سب سے بڑا مظہر آج ۵/جولائی کے اخبارات میں شائع شدہ صدر مملکت محمد یحیٰی خاں کا یہ بیان ہے کہ چواین لائی عنقریب پاکستان کا دورہ کریں گے)

> نہ صرف یہ' بلکہ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کو روس' امریکہ اور بھارت کے اتحادِ ثلاثہ کے احمقانہ دباؤ کے تحت کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ چین کی جانب جھکنا ہو گا اور یہ حالات کا ایک ایسا بہاؤ ہو گا' جس کے رخ کو روکنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں رہے گا----!!

ضرورت رشتہ

(۱) ہیومن ریسورسز مینجمنٹ اور کمپیوٹر سائنسز میں امریکہ سے تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے دینی مزاج کے حامل تعلیم یافتہ خاندان سے رشتہ درکار ہے۔

---

(۲) اسلام آباد میں مقیم کاروباری خاندان کی اسسٹنٹ پروفیسر' لڑکی کے لئے مناسب رشتہ درکار ہے۔

معرفت : سردار اعوان K-36' ماڈل ٹاؤن لاہور

"حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!"

اکتوبر ۱۹۶۹ء

سالِ رواں کے اس رُبع کے دوران میں جو واقعات عالمِ اسلامی میں رونما ہوئے اور جن حوادث کا سامنا امّتِ مسلمہ کو رہا ان کی یاد سے کلیجہ شق ہوتا ہے' اتنے گوناگوں مصائب اور ایسے پے بہ پے حوادث کہ انسان حیران و پریشان ہو کر رہ جائے کہ ع

"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!"

ایک طرف مسجدِ اقصیٰ کو نذرِ آتش کیا گیا اور عالمِ اسلامی کے روحانی مراکز میں سے تیسرا عظیم ترین مرکز' حرمِ ثالث اور ان تین مقدس ترین مقامات میں سے ثالثُ ثلاثہ جن کی زیارت کی نیت سے شدِّ رحال کی آنحضور ﷺ نے اجازت دی ہے---- آگ کے شعلوں میں لپٹ کر پورے عالمِ اسلام کے لئے مجسم دعوتِ آہ و فغاں بن گیا۔

"رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!!"

پورا عالمِ اسلام بے قرار ہو گیا' قلوب مضطرب ہو گئے' روحیں بے چین ہو گئیں' غم واندوہ اور غیظ و غضب کی ایک لہر پوری ملّتِ اسلامی کے جسد میں دوڑ گئی---- لیکن آخرش "قہرِ درویش بر جانِ درویش!" کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ پوری ملّتِ اسلامی بس تلملا کر رہ گئی۔ اس لئے کہ ع

"ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!"

جس طرح بسا اوقات کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے ہی میں عافیت دیکھتا ہے اسی طرح جی چاہتا ہے کہ اس صورت حال کے عواقب سے بھی آنکھیں بند کر لی جائیں اور قطعاً نہ سوچا جائے کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا!!---- بصورتِ دیگر سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے' اعصاب جواب دینے لگتے ہیں اور نبضیں چھوٹتی محسوس ہوتی ہیں---- دشمن ہمیں ٹٹول رہا ہے اور رفتہ رفتہ

ہماری کمزوریوں سے آگاہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی ہے ---- اور دفعۃً عالمِ ارضی کی پوری نام نہاد ملّتِ اسلامی کا بھرم کھل گیا ہے ---- ابھی تک معاملہ صرف فلسطینی عربوں کے حقوق کا تھا' جسے خود عربوں نے سخت ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر اپنا ایک داخلی سا مسئلہ بنا رکھا تھا' لیکن اب معاملہ پوری ملّتِ اسلامیہ کی دینی غیرت و حمیت کا ہے۔ اس ذلت کو اگر یہ پوری امت اس طرح گوارا کر گئی تو دشمن حرمِ نبوی ﷺ کی حرمت پر وار کرنے سے کب باز رہے گا؟ ---- آج کے دور میں جبکہ لاکھوں میل کے فاصلے کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی' اسرائیل کی موجودہ سرحدوں سے مسجدِ نبویؐ کا فاصلہ کل چھ سو میل ---- اور مسجدِ حرام کا فاصلہ قریباً آٹھ سو میل رہ گیا ہے ---- اور کم از کم حرمِ نبویؐ پر اپنے دعوائے استحقاق کو تو اسرائیل نے کبھی مخفی بھی نہیں رکھا! ---- ادھر قرآن حکیم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان امتوں کو ان کی بد عملی و بد کرداری کی سزا' ان کے مقاماتِ مقدسہ کی اغیار کے ہاتھوں بے حرمتی کی صورت میں بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ماضی کی امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو یہ سزا دو بار دی گئی :

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ○

(سورۂ بنی اسرائیل' آیت ۷)

"پھر جب آیا دوسری وعید کا وقت (تو مسلط کیا تم پر لوگوں کو) تاکہ بگاڑ دیں وہ تمہارا حلیہ اور داخل ہوں مسجد میں اسی طرح جس طرح داخل ہوئے تھے اس میں پہلی بار اور تباہ کر دیں ہر چیز کو جس پر بھی بس چل جائے!"

تو کیا اب ہماری سیہ کاریوں کی کالک حرمین شریفین کی مقدس پیشانیوں پر بھی مل جائے گی!! ---- عیاذاً باللّٰہ! عیاذاً باللہ!!

دوسری طرف بھارت میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی ---- اور تا حال یہ شغل جاری ہے!! یوں تو ہندی مسلمانوں پر ظلم و تشدد اور تعدّی و عدوان بھارت کی ہندو جاتی کا روز کا معمول ہے' لیکن احمد آباد اور اس کے گرد و نواح میں تو ان دنوں بالکل ۱۹۴۷ء کی خونچکاں داستان دہرائی گئی اور بعینہٖ وہی نقشہ سامنے آگیا کہ ع ---- "ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو!"

اللہ کی شان ہے کہ جو شہر خود احمدِ مجتبیٰ ﷺ کے نامِ نامی سے معنون ہو اس میں ان ؐ ہی کے دین کے نام لیوا اس طرح بھیڑ بکریوں کے مانند ذبح ہو رہے ہیں اور پورا عالمِ اسلام ہے کہ "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کا نقشہ پیش کر رہا ہے---- در آنحالیکہ کتابِ الٰہی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ :

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ○ (سورۃ النساء : ۷۵)

"اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں اور ان مغلوب و مقہور مردوں، عورتوں اور بچوں (کی دادرسی) کے لئے جو کہتے ہیں کہ : اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں، اور ہمارے لئے اپنی جانب سے کوئی حمایتی اور مددگار اٹھا!"

اس معاملے میں یوں تو اس عالمِ ارضی کی پوری امّتِ مسلمہ کی ملی غیرت و حمیت کا مرثیہ کہنا چاہئے---- خصوصاً اس لئے کہ یہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ برصغیر ہندوپاک کی ملّتِ اسلامی نے ہمیشہ پورے عالمِ اسلامی کے رنج و غم کو اپنا دکھ درد شمار کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ صورت حال یہ رہی کہ چاہے کبھی بلقان و ترکی پر برا وقت آیا ہو، چاہے طرابلس و شام پر، ہندوستانی مسلمان بالکل اس طرح تڑپ اٹھتا رہا جیسے خود اس کے پہلو میں خنجر بھونکا گیا ہو۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ!
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!!

لیکن ادھر یہ عالم ہے کہ بھارت میں "فِی کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوْ مَرَّتَیْنِ" مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے، لیکن عالمِ اسلام---- اور بات کہنے کی نہیں لیکن ع "خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!" کے مصداق کہنی پڑتی ہے کہ خصوصاً عالمِ عرب کا حال یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت بھارت کی نیازمندی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے اور اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے ایک دوسرے سے زیادہ بے تاب نظر آتی ہے---- ماضی میں پنڈت نہرو کو عین مملکتِ عربیہ سعودیہ میں حرمین شریفین کی خادم و محافظ حکومت نے "رسول السلام" کے خطاب سے نوازا----

اور اس موقع پر تو حد ہو گئی کہ عین اس وقت جبکہ بھارت کے ایک صوبائی دارالحکومت میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا اور گھاس پھونس کی طرح جلایا جا رہا تھا' زعمائے عرب' رباط کی مسلم سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت پر زور دے رہے تھے اور اس معاملے میں ان کی صفوں میں ایک غیر معمولی اتحاد و اتفاق نظر آ رہا تھا' حتیٰ کہ اس حمام میں "رجعت پسند شاہ پرست" اور نام نہاد "ترقی پسند" سب یکساں ننگے تھے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے!

عالمِ اسلام اور خصوصاً عالمِ عرب سے یہ گلہ شکوہ قدرے دور کی بات سہی' لیکن ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے لئے تو یہ واقعتاً ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ جن کی قربانیوں کے طفیل آج نہ صرف یہ کہ آزادی کے سانس لے رہی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گلچھرے اڑا رہی ہے ان پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھ کر بھی یہ ٹس سے مس نہیں ہوتی ---- خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور مکافاتِ عمل صرف عالمِ آخرت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اقوام و ملل کے اجتماعی جرائم کا حساب تو اکثر و بیشتر یہیں چکا دیا جاتا ہے ---- ہمارے لچھن اگر وہی رہے کہ جو اب ہیں اور ہم اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے خون کی سرخی کو شرابِ ارغوانی اور غازۂ چہرۂ نسوانی میں تبدیل کرتے رہے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا ----!!

کم از کم ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم ہندی مسلمانوں پر ظلم و ستم کی اس پیہم یلغار کو اسی طرح خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے اور ہماری رگِ حمیت صرف اسی قدر جوش کھاتی رہی کہ ہر بار ظالموں کی اس منڈلی کی دہائی دی جاتی رہی جسے اقوامِ متحدہ کہا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ ہماری حمیتِ قومی اور غیرتِ ملی کا جنازہ بالکل نکل جائے گا اور وہ وقت زیادہ دور نہیں جب صورت وہ ہو جائے گی کہ ؏ :

"حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!"

پھر تاریخ کی یہ شہادت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس گھرانے سے غیرت و حمیت رخصت ہو جائے اس سے آزادی اور خود اختیاری کو بھی روانہ ہوتے دیر نہیں لگتی! اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے! آمین۔

اندرونِ ملک کے حالات کو دیکھئے تو مزید مایوس کن صورت حال نظر آتی ہے اور ؏

"تن ہمہ داغ داغ شد' پنبہ کجا کجا نہم!"

کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اوپر کا سارا گلہ شکوہ ہی بے بنیاد نظر آنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سارا "استغاثہ" تو صرف "ملّتِ اسلامیہ" کے نام مناسب ہو سکتا ہے اور یہاں یہ تصور ہی کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم کے درجے کو پہنچ چکا ہے ؏:

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!"

چنانچہ جس قسم کے نعرے آج سے پچیس تیس سال قبل عالم عرب میں لگے تھے یعنی "المِصرُ لِلمِصریین!" (مصر مصریوں کا ہے!) اسی قسم کے نعرے آج سرزمینِ پاک میں بلند ہو رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں تو بنگالی قومیت کا راگ شروع ہی سے الاپا جا رہا تھا۔ اب سندھ بھی "جئے سندھ" کے نعروں سے گونج رہا ہے اور یہی حال بلوچستان اور سابق صوبۂ سرحد کا ہے' ---- وہاں پختونستان کا سٹنٹ تو قدیم تھا ہی' ایک نئی دو عملی یہ ایجاد ہوئی ہے کہ "عظیم باپ" افغانستان میں بیٹھ کر آزاد پختونستان کے نعرے کو ہوا دے رہا ہے اور اس کی صُلبی و معنوی ذریت پاکستان میں بیٹھ کر اس کی ایک دوسری نسبتاً کم قابل اعتراض تعبیر پیش کر رہی ہے ---- الغرض وہ نغمہ کہ۔

"بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
کہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی!!"

جو تحریک پاکستان کے دوران خوب زور شور سے بلند ہوا تھا' ایران و افغانستان تک کیا پہنچتا خود پاکستان میں دم توڑ رہا ہے {۱}۔ پوری ارضِ پاک میں ایک خطۂ پنجاب ہے جو شاید اپنے اس مایۂ ناز

{۱} خود ہم نے جولائی کے شمارے میں پاکستان کی اجتماعی زندگی کی جن الجھنوں اور پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا تھا ان میں سے تیسری الجھن جو مضمون کی دوسری قسط میں بیان ہونی تھی یہی ہے کہ پاکستان میں "قومیت" کا ایک ہولناک خلا ہے جو کوئی آج پیدا نہیں ہوا بلکہ بالکل ابتدا سے چلا آ رہا ہے لیکن بعد میں ہم نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے اس لئے احتراز کیا کہ ؏ "اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں!" سرِدست صرف اس اشارے پر اکتفا مناسب ہے کہ پاکستان قائم تو "ملت از وطن است!" کی پر زور نفی اور "ملتِ اسلامی" کے تصور کے زوردار اثبات پر ہوا تھا' لیکن خود اس کے قائم کرنے والے نے پہلے ہی روز غیر مبہم الفاظ میں یہ کہہ کر کہ : "پاکستان میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سپوت کی لاج رکھنے کو جسے دنیا علامہ اقبال کے نام سے جانتی ہے "رجوع الی الجاہلیت" کی اس وبا سے قدرے بچا ہوا ہے---- لیکن تابہ کے؟---- اگر یہ ایک واقعی قانونِ فطرت ہے کہ "ہر عمل ایک ردِ عمل کو جنم دیتا ہے!" تو جلد یا بدیر یہاں بھی وہی صورت پیدا ہو کر رہے گی----!

اس صورت حال میں ہندی مسلمانوں کی داد رسی کی توقع کس سے ہو؟---- یہاں تو بنگالی مسلمان نے غیر بنگالی مسلمان کا خون بہانے سے دریغ نہ کیا۔ کوئٹے میں بار بار فسادات کی آگ بھڑکی اور سندھ کے متعدد شہروں میں غیر سندھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا باقاعدہ پروگرام بن چکا تھا---- یہ تو بھلا ہو مارشل لاء کا کہ بروقت نافذ ہو گیا ورنہ مغربی پاکستان بھی اس میدان میں مشرقی پاکستان کی ہمسری کا شرف حاصل کر لیتا۔

تشتّت و انتشار کی اس گرم بازاری میں مزید اضافہ دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کی ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے ہو گیا ہے' چنانچہ دونوں کیمپوں میں ایک دوسرے سے نفرت اور بیزاری بڑھتی جا رہی ہے اور اشتعال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے حتیٰ کہ تشدد اور تصادم اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان' مذہبی اعتبار سے نہیں' اس لئے کہ وہ تو ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے.....!" ملتِ اسلامی کے تصور کی نفی اور "وطنی قومیت" کا اثبات کر دیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے ہمارے یہاں "ملتِ اسلامی" اور "پاکستانی قومیت" کے مابین ایک گھپلا جاری ہے۔ اور یہ اسی گھپلے کے ثمرات ہیں جو آج علاقائی و لسانی قومیتوں کے فروغ کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ نظریۂ ملت کو خود ہم نے منہدم کر دیا اور پاکستانی قومیت کا تصور ہمارے مزاج کے مناسب نہ تھا چنانچہ ہماری اجتماعی زندگی میں وہ خلا پیدا ہوا جو رفتہ رفتہ متذکرہ بالا قومیتوں اور عصبیتوں سے پُر ہوا---- چنانچہ اب شکایت ہو تو کس سے اور گلہ ہو تو کس کا؟ کہ---- ؏ "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!!"

اگرچہ یہ اندیشہ بھی شدید ہے کہ بات کہیں "حدود" سے تجاوز نہ کر جائے' لیکن دردِ دل بالکل خاموش بھی نہیں رہنے دیتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے "مبینہ" الفاظ پر تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور آج تک بھی ان کا قصور معاف نہیں ہوا' حالانکہ جب انہوں نے اپنے بیان کی وضاحت فرمائی تو علامہ اقبال نے بھی اپنے اشعار سے رجوع کر لیا تھا۔ لیکن بانی پاکستان کے اس نظریہ وطنیت پر تنقید کی جرأت کسی کو نہ ہوئی حتیٰ کہ علماء بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔

دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ!
بتکدے میں برہمن کی پختہ زُناری بھی دیکھ!!

فیصلہ کن مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور نوجوان ایک دوسرے پر پل پڑنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔

رہی سہی کسر علمائے دیوبند کے دو متحارب گروہوں نے ایک دوسرے کے مقابل آکر پوری کر دی ہے۔ ان کے مابین بغض حادث نہیں قدیم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے تک ان کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کے مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے لیکن معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ "تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى" والا معاملہ تھا' چنانچہ جونہی دوبارہ اختلاف رونما ہوا فضا ایک دم شرعی گالیوں سے معمور ہو گئی ----- بنائے نزاع "سوشلزم" کو قرار دیا گیا ہے۔ در آنحالیکہ سرمایہ داری کے دونوں ہی گروہ یکساں مخالف ہیں۔ اور مزدوروں اور کسانوں کی "حالتِ زار" کا دونوں ہی کو برابر رنج و غم ہے۔ حتیٰ کہ معاشی عدل و اعتدال کے لئے فوری تدابیر میں بھی دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ----- بایں ہمہ کفر کے فتوے عام ہو رہے ہیں اور "کانگرسی مولوی" کی گالی میں تو خیر کوئی مضائقہ ہی نہیں ع

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبی است"

عجیب طرفہ تماشا ہے کہ "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح تو سر آنکھوں پر لیکن "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح قطعاً ناجائز و حرام ----- پھر مزید یہ کہ جس شخص نے سب سے پہلے یہ اصطلاح استعمال کی یعنی محمد علی جناح مرحوم وہ تو سب کے نزدیک قائداعظم اور رحمتہ اللہ علیہ' لیکن اب جو بھی یہ لفظ منہ سے نکالے وہ کافر و مرتد۔ بحالی جمہوریت کے لئے تو ہر کس و ناکس سے تعاون کو جائز ہی نہیں لازمی و ناگزیر قرار دیا جائے اور معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کی غرض سے کوئی مزدوروں سے اتحاد کر لے تو گردن زدنی ٹھہرے!۔

خدا وندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کا انجام کیا ہو گا ----- اور ہماری قومی و ملی زندگی کس حادثے سے دوچار ہو گی۔ بظاہر احوال تو امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی!

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS

NTN BEARINGS

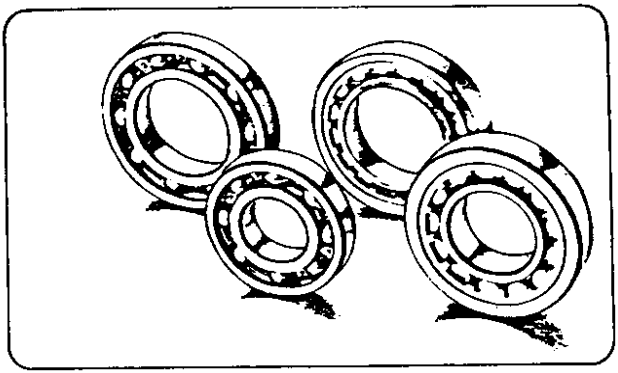

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : **(Opening Shortly)** Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Reg No. L 7360
Vol. 45 No. 5
May___ 1996

Quarterly Journal
of the
Qur'an Academy

Patron: Dr. Israr Ahmad

The Qur'anic Horizons

Price per issue: Rs. 30/- Annual Subscription: Rs. 100/-

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an
36-K, Model Town, Lahore-54700